جاوید احمد غامدی

سود کا مسئلہ

انسان کسی کو قرض دے اور اُس پر نفع کا مطالبہ کرے تو یہ سود ہے۔ اِس میں اور کرایے میں بظاہر کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، لیکن دقت نظر سے دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ جو چیزیں کرایے پر اٹھائی جاتی ہیں، وہ اُن کے وجود کو برقرار رکھ کر استعمال کی جا سکتی ہیں، مگر روپیہ اِس طریقے سے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے خرچ کر لینے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اُس پر اگر کسی اضافے کا مطالبہ کیا جائے تو یہ فی الواقع ظلم بن جاتا ہے۔ سود اور کرایے میں یہ فرق چونکہ باریک ہے اور انسان اِس کو سمجھنے میں غلطی کر سکتا تھا، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے انسان کو اپنی شریعت دی تو اُسے بتا دیا کہ قرض پر اضافے کا مطالبہ زیادتی ہے، اِسے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ سود اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ کی ہر شریعت میں اور ہمیشہ ممنوع رہا ہے۔ قرآن نے بھی پوری صراحت کے ساتھ اِسے ممنوع ٹھیرایا ہے، اِس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بنکاری کا جو نظام اِس زمانے میں رائج ہے، اُس کے بارے میں یہ بحث، البتہ پیدا ہو گئی ہے کہ اِس میں تو بنک جس کاروبار کے لیے قرض دیتا ہے، اُس کی منفعت ہی سے حصہ وصول کرتا ہے۔ لہٰذا سود جس علت کی بنا پر ممنوع قرار دیا گیا ہے، وہ بنکاری کے نظام میں کیا ختم نہیں ہو جاتی؟ یہ استدلال مصر و شام کے بعض علما نے بھی پیش کیا ہے اور ہندوستان کے ایک جلیل القدر عالم اور داعی مولانا وحید الدین خان نے بھی اپنی کتاب ''فکر اسلامی'' میں کسی حد تک اِس کی تصویب فرمائی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ علما کا یہ استدلال معقول ہو سکتا ہے، مگر اِس کے لیے ضروری ہے کہ بنک اپنے نظام میں درج ذیل اصلاحات کر لیں:

اولاً، جس کاروبار کے لیے روپیہ دیا گیا ہے، اُس میں نقصان ہو جائے یا کاروبار کسی وجہ سے بند کرنا پڑے تو

منفعت کا مطالبہ بھی اُسی دن سے بند کر دیا جائے۔ بنک اِس کے بعد صرف اصل زر کا مطالبہ کرے۔

ثانیاً، اشیا قسطوں پر فروخت کی جائیں تو جب تک قسطیں پوری نہ ہوں، بنک اُس شے کی ملکیت میں شریک رہے، ملکیت کے تقاضے پورے کرے اور اُن پر کرایہ لے۔

ثالثاً، روپیہ اگر غیر کاروباری ضرورتوں کے لیے قرض دیا گیا ہے تو افراط زر سے جو کمی واقع ہوتی ہے، اُس کی تلافی کے سوا کسی زائد رقم کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

یہ اصلاحات کر لی جائیں تو بنکاری کا نظام بڑی حد تک منصفانہ ہو جاتا ہے۔ تاہم دو سوالات اور بھی ہیں:

ایک یہ کہ جو لوگ سود لیتے نہیں، مگر ذاتی اور کاروباری ضرورتوں کے لیے قرض لیتے اور اُن پر سود دیتے ہیں، اُن کا حکم کیا ہو گا؟

دوسرے یہ کہ حکومتیں بالعموم بچت کی مختلف اسکیمیں بنا کر اپنی ضرورتوں کے لیے لوگوں سے قرض لیتی اور اُس پر کچھ منفعت بھی دیتی ہیں۔ اُس کا کیا حکم ہے؟ کیا اُسے بھی ممنوع قرار دیا جائے گا؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ سود دینے پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، اِس لیے کہ سود کی حرمت اکل الاموال بالباطل کے اصول پر ہے اور سود دینے والا کسی کا مال باطل طریقے پر نہیں کھاتا، بلکہ اپنی جائز کمائی کا ایک حصہ قرض کے معاوضے میں قرض دینے والے کو ادا کرتا ہے۔ سود کا مسئلہ قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر زیر بحث آیا ہے، مگر ہر جگہ دیکھ لیجیے، اُس نے ایک لفظ بھی سود دینے والوں کی مذمت میں نہیں کہا، بلکہ اُنھیں مظلوم قرار دیا اور تنگ دست ہوں تو اصل زر کی واپسی کے لیے مہلت دینے کی تلقین فرمائی ہے۔ جو لوگ اِسے ممنوع قرار دیتے ہیں، اُن کے استدلال کی بنیاد قرآن کی کوئی آیت یا اُس کا اقتضا یا اشارہ نہیں ہے، بلکہ ایک حدیث ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے اور کھلانے والے، دونوں پر لعنت کی ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: لعن النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم ... اٰکل الربٰو و موکله*۔ اِس میں کھلانے والے کے لیے لفظ 'موکل' آیا ہے۔ لغت کے اعتبار سے اِس لفظ کا مصداق سود دینے والے بھی ہو سکتے ہیں اور سودی کاروبار کرنے والوں کے ایجنٹ بھی جو اُن کے لیے گاہک ڈھونڈ کر لاتے اور قرض لینے والوں سے مقرر وقت پر سود وصول کر کے اُن تک پہنچاتے ہیں۔ سود پر قرض کے معاملات اگر باقاعدہ کاروبار کی صورت اختیار کر لیں تو اِس طرح کے ایجنٹوں کا وجود ناگزیر ہے۔ اِن کے بغیر سودی کاروبار نہیں چلایا جا سکتا۔ حدیث میں اگر یہی لوگ مراد ہیں تو کوئی اشکال نہیں ہے، اِس لیے کہ یہ صریح تعاون علی الاثم

---

* بخاری، رقم ۵۳۴۷۔

ہے۔سودی کاروبار کرنے والوں کے کارکنوں کی حیثیت سے جو لوگ اُن کے لیے سودی دستاویزات تیار کرتے اور اُن پر گواہ بنتے ہیں، اُن کا معاملہ بھی اِسی طرح کا ہے۔موجودہ بنکاری نظام کا عملہ یہی خدمات انجام دیتا ہے۔لیکن سودی قرض لینے والوں کو کسی طرح بھی تعاون علی الاثم کا مرتکب قرار نہیں دے سکتے۔ یہ تعبیر اُسی عمل کے لیے موزوں ہو سکتی ہے جو کسی گناہ کے مرتکبین کی طرف سے اور گناہ کے ثمرات میں شرکت کے لیے کیا جائے۔سودی قرض لینے والے سود خواروں کی معاونت کے لیے نہیں، اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں کے لیے اُن سے قرض لیتے ہیں۔ یہ اگر تعاون ہے تو اُس سے زیادہ نہیں ہے جو اِس وقت علما اور صلحا بھی اپنی اور اپنے اداروں کی رقوم بنکوں میں جمع کرا کے کر رہے ہیں۔سود کو ریاست کی سطح پر ممنوع قرار دے کر ہر نوعیت کا سودی کاروبار بند کرا دیا جائے تو یہ، البتہ قانون کی خلاف ورزی کے مجرم ٹھیرائے جا سکتے ہیں۔حدیث میں اگر اِنھی کا ذکر ہے تو اُس کو پھر اُس موقع سے متعلق ماننا چاہیے، جب سودی کاروبار زمانۂ رسالت میں اِسی طریقے سے بند کرا دیا گیا تھا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ بچت کی مذکورہ اسکیمیں عام سودی معاملات کی طرح نہیں ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِن اسکیموں کے ذریعے سے حکومتیں قرض دینے والوں کی شرائط پر نہیں، بلکہ اپنی شرائط پر قرض لیتی ہیں۔ پھر یہی نہیں، اُس کے لیے منفعت کی شرح بھی خود طے کرتی اور اپنی صواب دید سے اُسے کم و بیش بھی کر دیتی ہیں۔ یہ اگرچہ بعینہٖ وہ چیز تو نہیں ہے کہ کسی سے قرض لے کر اُس کی طرف سے کسی مطالبے کے بغیر کچھ اضافے کے ساتھ واپس کر دیا جائے، مگر اُس کے قریب ضرور ہے۔سود کی ممانعت جس زیادتی کو روکنے کے لیے ہوئی ہے، اُس کی شناعت کو معاملے کی یہ صورت بڑی حد تک کم کر دیتی ہے۔اہل تقویٰ کے لیے تو موزوں یہی ہے کہ اِن سے بھی اجتناب کریں، لیکن عام لوگ، خاص طور پر یتامیٰ، بیوائیں اور ریٹائرڈ ملازمین جو اپنی پونجی کاروباری تجربات کی نذر کرتے ہوئے گھبراتے ہیں، اگر اپنی ناگزیر ضرورتوں کے لیے اِن اسکیموں سے فائدہ اٹھائیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ اِس پر وہ کسی مواخذہ سے دوچار نہیں ہوں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الاعراف

(۶)

(گذشتہ سے پیوستہ)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ
اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ

(تمھاری تاریخ بھی اِنھی حقائق کی گواہی دیتی ہے[۳۹۳])۔

ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اُس نے اُنھیں دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے[۳۹۴]۔ میں تم پر ایک ہول ناک دن کے عذاب

۳۹۳؎ سورہ کے مخاطب چونکہ قریش ہیں، اِس لیے آگے استدلال کے غرض سے اُنھی قوموں کی سرگذشتیں سنائی ہیں جن سے وہ واقف تھے اور اُن کی سرگذشتوں میں سے بھی صرف اتنا حصہ نمایاں کیا ہے جو انذار کے مقصد سے ضروری تھا۔ مدعا یہ ہے کہ عقل و فطرت کے دلائل سے نہیں مانو گے تو ہمارے پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد تم بھی اُسی انجام کو پہنچ جاؤ گے جس کو تم سے پہلے رسولوں کی قومیں پہنچی ہیں۔

۳۹۴؎ یہی دعوت پیچھے قریش کو دی گئی ہے۔ انبیا علیہم السلام کی تمام جدوجہد کا مقصود اِسی توحید کا قیام تھا۔ وہ اِسی لیے بھیجے گئے کہ خدا کے بندوں کو دوسروں کی بندگی سے چھڑا کر خالص خدا کے بندے بنا دیں۔ قرآن نے سب سے زیادہ تاکید اور وضاحت کے ساتھ اِسی کو بیان کیا ہے، یہاں تک کہ اِس صحیفۂ آسمانی کا آخری باب اپنے مضمون کے

مُّبِیۡنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ یٰقَوۡمِ لَیۡسَ بِیۡ ضَلٰلَۃٌ وَّلٰکِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶۱﴾
اُبَلِّغُکُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ وَاَنۡصَحُ لَکُمۡ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۲﴾ اَوَعَجِبۡتُمۡ
اَنۡ جَآءَکُمۡ ذِکۡرٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَلٰی رَجُلٍ مِّنۡکُمۡ لِیُنۡذِرَکُمۡ وَلِتَتَّقُوۡا وَلَعَلَّکُمۡ

سے ڈرتا ہوں۔[395] اُس کی قوم کے بڑوں نے جواب دیا: ہم تو تمھیں صریح گمراہی میں دیکھ رہے ہیں۔[396] اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، میں کسی گمراہی میں نہیں ہوں، بلکہ رب العٰلمین کا رسول ہوں، تمھیں اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا رہا ہوں، تمھاری خیر خواہی کر رہا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ کیا اِس بات پر تعجب کر رہے ہو کہ تمھارے پاس خود تمھارے اندر کے ایک شخص کے ذریعے سے تمھارے پروردگار کی یاددہانی آئی ہے، اِس لیے کہ تمھیں خبردار کرے اور اِس لیے کہ

لحاظ سے جس سورہ پر ختم ہوا ہے، اُس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو یہی ہدایت فرمائی ہے کہ لوگوں کے سامنے برملا اعلان کر دیا جائے کہ اللہ یکتا، یگانہ اور بے ہمتا ہے، سب کے لیے پناہ کی چٹان ہے، وہ نہ باپ ہے نہ بیٹا اور نہ زمین و آسمان میں کوئی اُس کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہ توحید تقاضا کرتی ہے کہ لوگ بالکلیہ اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیں، اُس کی ذات و صفات اور اُس کے حقوق میں اُس کی یکتائی تسلیم کریں، اُسی سے مدد چاہیں، نعمت ملے تو اُسی کا شکر ادا کریں، مصیبت آئے تو اُسی سے فریاد کریں، بیم و رجا، ہر حال میں اُسی کو پکاریں اور کسی فرشتے، جن، پیغمبر، ولی یا کسی بھی مخلوق کو کسی پہلو سے اُس کا شریک نہ ٹھیرائیں۔

۳۹۵؎ یہ اُس عذاب سے انذار ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجے میں لازماً آتا ہے اور اُن کی قوموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت زمین پر خدا کی دینونت کا ظہور ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک قیامت صغریٰ لوگوں کو اِسی دنیا میں برپا کر کے دکھا دی جاتی ہے تاکہ آخرت کا تصور بھی اُسی معیار پر ثابت کر دیا جائے جس معیار پر سائنسی حقائق معمل (Laboratory) کے تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں۔

۳۹۶؎ اِس لیے کہ تم اُس راستے سے منحرف ہو گئے ہو جس پر ہمارے باپ دادا ہمیشہ سے چلتے آئے ہیں۔ تم اُن کے دین کی تحقیر کر رہے ہو اور مزید یہ کہ ہمیں عذاب کی دھمکیاں بھی سنا رہے ہو۔ یہ صریح گمراہی ہے جس میں تم مبتلا ہو گئے ہو۔

تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوۡهُ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ فِى الۡفُلۡكِ وَاَغۡرَقۡنَا الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا عَمِيۡنَ ﴿۶۴﴾

تم (اللہ سے) ڈرو اور اِس لیے کہ تم پر رحم کیا جائے[۳۹۷]؟ اُنھوں نے پھر بھی اُسے جھٹلا دیا تو ہم نے اُسے اور جو کشتی میں اُس کے ساتھ تھے، اُنھیں نجات دی اور اُن سب لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا[۳۹۸]۔ یقیناً وہ (دل و دماغ کے) اندھے تھے۔ ۵۹-۶۴

۳۹۷؎ قرآن نے سوال اٹھایا ہے، لیکن جواب نہیں دیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس لیے کہ انداز کلام اظہار حسرت و افسوس کا ہے۔ اِس اسلوب بیان میں یہ بات مضمر ہے کہ اگر تم سوچتے، غرور و انانیت کو راہ نہ دیتے تو یہ چیز تمھارے لیے تعجب اور استکبار کے بجاے ممنونیت اور شکر گزاری کا باعث ہوتی کہ خدا نے تمھارے ہی اندر سے ایک شخص کو تمھیں نجات کی راہ دکھانے کے لیے اٹھایا۔ میں تمھارے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں، میرا ماضی و حاضر اور میرا اخلاق و کردار، سب تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میری زبان تمھاری زبان اور میرا دل تمھاری اپنی فطرت کا ترجمان ہے تو کیا یہ بہتر ہوتا کہ تم پر اتمام حجت کے لیے آسمان سے کوئی فرشتہ اترتا یا یہ بہتر ہے کہ تمھاری اپنی ہی زبان اور تمھارا اپنا ہی درد آشنا دل تم پر گواہی دے؟ اسلوب کلام میں یہ ساری داستان مضمر ہے اور یہ اضمار ہی اِس محل میں تقاضاے بلاغت ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۹۵)

۳۹۸؎ اِس سے واضح ہے کہ یہ عذاب اُسی علاقے میں اور اُنھی لوگوں پر آیا جن پر نوح علیہ السلام نے اتمام حجت کیا تھا۔ یہ دجلہ و فرات کے دوآبے کا علاقہ تھا۔ چنانچہ آرمینیا کی سرحد پر کوہ اراراط کے نواح میں لوگ اب بھی نوح علیہ السلام کے بعض آثار کی نشان دہی کرتے ہیں۔ قرآن میں اِس کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم میں رہے اور پوری دردمندی کے ساتھ اُسے متنبہ کرتے رہے۔ لیکن اِس طویل جدوجہد کے بعد بھی جب قوم نے اُن کی تکذیب کر دی اور اپنے رویے کی اصلاح پر آمادہ نہیں ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک کشتی بنائی جائے۔ یہ قوم کے لیے گویا الٹی میٹم تھا کہ کشتی کی تکمیل کے ساتھ ہی اُس کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہو جائے گا۔ چنانچہ کشتی بن گئی اور ماننے والے اُس میں سوار ہو گئے تو ایک عظیم طوفان ابل پڑا۔ زمین کو حکم دیا گیا کہ اپنا سارا پانی اگل دے اور آسمان کو حکم دیا گیا کہ اپنا سارا پانی برسا دے۔ پھر جو نشان مقرر کر دیا گیا تھا، پانی اُس پر جا کر ٹھیر گیا اور پوری قوم اُس میں غرق ہو گئی، یہاں تک کہ نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان بھی اپنی ہٹ دھرمی کے

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَالَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ اَفَلَا
تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖٓ اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْ سَفَاھَةٍ وَّاِنَّا
لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاھَةٌ وَّ لٰکِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ

عاد کی طرف ہم نے (اِسی طرح) اُن کے بھائی ہود کو بھیجا۔[۳۹۹] اُس نے دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا ڈرتے نہیں ہو؟[۴۰۰] اُس کی قوم کے بڑوں نے جو منکر ہو رہے تھے، (اُسے) جواب دیا: ہم تو یقیناً تمھیں حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہمارا پختہ خیال ہے کہ تم جھوٹے ہو۔[۴۰۱] اُس نے کہا: میری قوم کے لوگو، میں کسی حماقت میں مبتلا نہیں

باعث اُس کی نذر ہو گیا۔ یہ ایک عبرت انگیز منظر تھا۔ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کی طرح موجیں اٹھ رہی تھیں۔ نوح کی کشتی اُن کے تھپیڑوں سے نبرد آزما تھی کہ اتنے میں باپ نے دیکھا کہ سامنے بیٹا حیران و ششدر کھڑا ہے۔ اُس کو دیکھ کر شفقت پدری نے جوش مارا، پکار اٹھے کہ جان پدر، اب بھی موقع ہے، اِن منکروں کو چھوڑ کر کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ لیکن اِس ہول ناک منظر کو دیکھ کر بھی اُس کی ضد میں کچھ فرق نہیں آیا۔ اُس نے کہا: میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا۔ نوح علیہ السلام نے کہا: یہ پانی نہیں، قہر الٰہی ہے۔ اِس سے خدا کے سوا آج کوئی بچانے والا نہیں ہو سکتا۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اچانک ایک موج اٹھی اور بیٹے کو بہا لے گئی۔

۳۹۹ عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے۔ یہ سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن کا مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ عرب کے لٹریچر میں یہ اپنی قدامت کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور اپنی قوت و شوکت کے لیے بھی۔ حضرت ہود اِنھی کے ایک فرد تھے جنھیں رسول کی حیثیت سے اِن کی طرف مبعوث کیا گیا۔ قرآن نے امتنان و احسان کے لیے فرمایا ہے کہ عاد کی طرف ہم نے کسی اجنبی شخص کو نہیں، بلکہ اُنھی کے بھائی ہود کو بھیجا تاکہ اُن پر ہماری حجت ہر لحاظ سے پوری ہو جائے۔

۴۰۰ یعنی کیا ڈرتے نہیں ہو کہ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے بعد بھی شرک پر اصرار کرو گے تو اِس کا انجام کیا ہو گا؟

۴۰۱ مطلب یہ ہے کہ ہماری یہ شان و شوکت اور ترقی و استحکام دیکھ رہے ہو اور اِس کے باوجود ہمیں عذاب کی

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٧﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿٦٨﴾ اَوَعَجِبْتُمْ
اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ
خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا
فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ

ہوں، بلکہ رب العٰلمین کا رسول ہوں، تمھیں اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور پوری دیانت کے ساتھ تمھاری خیر خواہی کرنے والا ہوں۔ کیا اِس بات پر تعجب کر رہے ہو کہ تمھارے پاس خود تمھارے اندر کے ایک شخص کے ذریعے سے تمھارے پروردگار کی یاددہانی آئی ہے کہ تمھیں خبردار کرے؟ یاد کرو، جب اُس نے نوح کی قوم کے بعد تمھیں بادشاہی دی اور خوب محکم اور تنومند کیا[402]۔ سو اللہ کی شانوں کو یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ[403]۔ اُنھوں نے جواب دیا: کیا ہمارے پاس اِس لیے آئے ہو کہ ہم اکیلے خدا کی عبادت کریں اور اُنھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں[404]؟ یہی بات ہے تو جس عذاب کی دھمکی ہمیں سنا رہے ہو، اُسے لے آؤ، اگر تم سچے ہو۔ اُس نے کہا:

وعیدیں سناتے ہو۔ اِس کے معنی اِس کے سوا کیا ہیں کہ خرد باختہ ہو چکے ہو اور جھوٹی باتیں سنا کر ہمیں ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔

۴۰۲؎ یعنی عقلی لحاظ سے محکم اور جسمانی لحاظ سے تنومند۔ اِس کے لیے اصل میں 'زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'خَلْق' کے معنی یہاں ساخت کے ہیں جو باطنی اور ظاہری، دونوں طرح کی ہو سکتی ہے۔ عرب کی روایتوں سے بھی اِس کی تصدیق ہوتی ہے کہ قوم عاد دونوں ہی اعتبارات سے بڑی نمایاں تھی۔

۴۰۳؎ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ پیچھے جو بات کہی گئی ہے، وہ اپنے اندر امتنان اور تنبیہ، دونوں ہی کے پہلو رکھتی ہے۔

۴۰۴؎ اِس میں غصہ بھی ہے اور طنز بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اِس لیے پیغمبر بن کر کھڑے ہو گئے ہو کہ ہم اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر تمھارے پیرو بن جائیں؟

رِجْسٌ وَّغَضَبٌ اَتُجَادِلُوْنَنِیْ فِیْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ
اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۲﴾
وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ

تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر گندگی آ پڑی اور (اُس کا) غضب ٹوٹ پڑا۔[۴۰۵] کیا تم مجھ سے اُن ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں،[۴۰۶] جن کے لیے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟[۴۰۷] اچھا، انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ آخر کار ہم نے اُس کو اور اُنھیں جو اُس کے ساتھ تھے، اپنی رحمت سے بچا لیا اور اُن لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ۶۵-۷۲

(اِسی طرح) ثمود[۴۰۸] کی طرف (ہم نے) اُن کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اُس نے دعوت دی کہ میری قوم

۴۰۵؎ یعنی فیصلہ ہو گیا کہ کفر و شرک کی اِسی گندگی میں پڑے رہو گے اور اِس کے نتیجے میں خدا کے غضب کے مستحق ٹھیرو گے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...مطلب یہ ہے کہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اب اِس میں دیر نہیں ہے، اِس کو آیا ہی سمجھو، اِس لیے کہ جس ناپاکی و گندگی سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے، اُس کی بہت بڑی کھیپ تم نے اپنے اوپر لاد لی ہے۔ 'رِجس' کا اتنا بڑا انبار جمع کر لینے کے بعد اب خدا کے صاعقۂ عذاب کو دور نہ سمجھو۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۹۹)

۴۰۶؎ لوگ جن ہستیوں کو معبود بناتے اور اُن سے حاجتیں طلب کرتے ہیں، وہ درحقیقت اُن کے رکھے ہوئے نام ہی ہوتے ہیں جن کے پیچھے کوئی مسمّٰی نہیں ہوتا۔ اپنی طرف سے نام دے کر ایسے ایسے بت تراش لیے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے پوری کائنات کا نظم وہی چلا رہے ہیں، جبکہ درحقیقت اُن میں نہ کوئی بارش کا رب ہوتا ہے، نہ ہوا کا، نہ دولت کا، نہ صحت اور تندرستی کا اور نہ کوئی مشکل کشا، گنج بخش، داتا اور غریب نواز ہوتا ہے کہ اُنھیں کچھ دے سکے یا اُن کے کسی کام آ سکے۔

۴۰۷؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ شرک کے حق میں کوئی عقلی یا نقلی یا فطری دلیل نہ کبھی پیش کی جا سکی ہے اور نہ پیش کی

قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ بَيِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمۡ اٰيَةً فَذَرُوۡهَا تَاۡكُلۡ فِيۡۤ اَرۡضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَيَاۡخُذَكُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۷۳﴾ وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمۡ فِي الۡاَرۡضِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡ سُهُوۡلِهَا قُصُوۡرًا

کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمھارے پاس تمھارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح نشانی آ گئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمھارے لیے نشانی کے طور پر، لہٰذا اِس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے اور کسی برے ارادے سے اِس کو ہاتھ نہ لگانا، ورنہ ایک دردناک عذاب تمھیں آ پکڑے گا[409]۔ یاد کرو، جب قوم عاد کے بعد اللہ نے تمھیں بادشاہی[410] دی اور زمین

جاسکتی ہے۔

۴۰۸؎ یہ عاد کے بقایا میں سے ہیں۔ اِسی بنا پر اِنھیں عاد ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ عرب کی قدیم اقوام میں سے یہ دوسری قوم ہے جس نے عاد کے بعد غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اِن کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ ہے جسے الحجر کہا جاتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...ہوسکتا ہے کہ قوم عاد کی تباہی کے وقت جو لوگ عذاب سے محفوظ رہے ہوں، اُنھوں نے جنوب سے شمال مغرب کی طرف ہجرت کی ہو اور پھر حجر میں سکونت اختیار کر لی ہو۔ عاد و ثمود کے اوصاف قرآن میں بھی اور عرب کی روایات میں بھی تقریباً ایک ہی سے بیان ہوئے ہیں۔ بعض شاعر تو اِن دونوں قوموں کا ذکر اِس طرح کرتے ہیں، گویا اِن کے درمیان کوئی فرق سرے سے ہے ہی نہیں۔ دونوں کے لیڈر ـــــ قیل اور قدار ـــــ جن کے ہاتھوں اِن قوموں پر تباہی آئی، عربی ادب میں ضرب المثل ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بالکل ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔'' (تدبر قرآن ۳/۳۰۰)

۴۰۹؎ یہ قوم کے مطالبۂ عذاب کا جواب ہے کہ خدا کے حکم پر میں نے اپنی اونٹنیوں میں سے ایک اونٹنی نامزد کر دی ہے۔ یہ خدا کی نذر ہے، چنانچہ اِس لحاظ سے اللہ کی اونٹنی ہے۔ تمھارے لیے یہ خدا کے عذاب کی نشانی ہے۔ اِس کو گزند پہنچاؤ گے تو سمجھ لو کہ امان کی دیوار گر گئی۔ اِس کے بعد قہر الٰہی کے سیلاب کو کوئی چیز تمھاری بستیوں میں داخل ہونے سے نہیں روک سکے گی۔

۴۱۰؎ اصل میں لفظ 'خُلَفَآء' استعمال ہوا ہے۔ یہ جس طرح نائب اور جانشین کے معنی میں آتا ہے، اِسی طرح

وَّتَنۡحِتُوۡنَ الۡجِبَالَ بُيُوۡتًا فَاذۡكُرُوۡۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ﴿۷۴﴾
قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ لِلَّذِيۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِمَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ اَتَعۡلَمُوۡنَ
اَنَّ صٰلِحًا مُّرۡسَلٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلَ بِهٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيۡنَ
اسۡتَكۡبَرُوۡۤا اِنَّا بِالَّذِىۡۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۷۶﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوۡا عَنۡ اَمۡرِ

میں تمکن عطا فرمایا، تم اُس کے میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور پہاڑوں کو گھروں کی صورت میں تراش لیتے ہو[411]۔ سو اللہ کی شانوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد نہ مچاتے پھرو[412]۔ اُس کی قوم کے بڑوں نے جو متکبر ہو چکے تھے، (اپنی قوم کے) اُن زیردستوں[413] سے جو ایمان لے آئے تھے، کہا: کیا تم سمجھتے ہو کہ صالح اپنے رب کا بھیجا ہوا ہے[414]؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہم تو اُس پیغام کو مانتے ہیں جس کے ساتھ اُسے بھیجا گیا ہے[415]۔ (اِس پر) اُن متکبروں نے کہا: (لیکن) ہم اُس کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لے آئے

نیابت اور جانشینی کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض صاحب اقتدار کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سورۂ ص (۳۸) کی آیت ۲۶ میں اِس کی نظیر موجود ہے۔ ہم نے اِسی لحاظ سے اِس کا ترجمہ بادشاہی کیا ہے۔ لفظ کے اِس طرح اپنے معنی کے کسی پہلو سے مجرد ہو کر آنے کی مثالیں عربی زبان میں اور بھی ہیں۔

۴۱۱؎ اپنے اِس فن میں یہ لوگ جس کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اُس کے آثار آج بھی مدائن صالح میں موجود ہیں۔ یہ آثار ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں اور کم و بیش ویسے ہی ہیں، جیسے ہندوستان میں ایلورا، ایجنٹا اور بعض دوسرے مقامات میں پائے جاتے ہیں۔

۴۱۲؎ یعنی اِس ترقی و کمال اور عروج و اقتدار کو خدا کی شان کا ظہور سمجھ کر اُس کا شکر بجا لاؤ اور اُس کے مقابلے میں تمرد اور سرکشی کا رویہ اختیار نہ کرو۔ اِس سے معلوم ہوا کہ مادی ترقی کوئی جرم نہیں ہے اور نہ فلک بوس عمارتیں بنانا کسی فساد کی نشانی ہے۔ اِس میں فساد اُس وقت پیدا ہوتا ہے، جب انسان اِن کمالات میں خدا کی شانیں دیکھنے کے بجائے خدا فراموشی کا رویہ اختیار کر لیتا اور خدا کے قائم کردہ حدود سے تجاوز کر کے سرکشی اور تمرد پر اتر آتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو سیدنا سلیمان علیہ السلام کے 'صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِيۡرَ' کی طرح یہی عمارتیں معرفت الٰہی کی نشانی بن جاتی ہیں۔

۴۱۳؎ انبیا علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے میں بالعموم غریبوں، ضعیفوں اور دبے ہوئے لوگوں ہی نے سبقت

رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ

ہو۔[۲۱۶] پھر انھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی[۲۱۷] اور صالح سے کہہ دیا کہ اگر تم خدا کے بھیجے ہوئے ہو تو لے آؤ وہ (عذاب) جس کی دھمکی دے رہے ہو۔ آخر ایک سخت تھرتھراہٹ[۲۱۸] نے اُنھیں آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ

کی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن میں دولت و اقتدار کا غرور نہیں ہوتا کہ قبول حق میں رکاوٹ بن جائے۔

۲۱۴؎ یہ سوال استنکار کی نوعیت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا فی الواقع اُسے خدا کا رسول سمجھتے ہو؟ اِس کے معنی تو ہیں کہ بالکل ہی بے وقوف ہو گئے ہو۔

۲۱۵؎ یعنی صرف یہی نہیں، بلکہ اُس پیغام کو بھی پورے شرح صدر کے ساتھ مان چکے ہیں جو خدا نے اُس کے ذریعے سے بھیجا ہے اور اب عزم و جزم کے ساتھ اُس کی گواہی دے رہے ہیں۔ ہمارے لیے اِس پیغام کی قوت و حجت ہی کافی تھی۔ ہم تمھاری طرح معجزوں اور کرشموں کے منتظر نہیں رہے کہ بدبختی کے اُس مقام تک پہنچ جاتے، جہاں تم کھڑے ہو۔

۲۱۶؎ یہ آخری جھنجھلاہٹ کا اظہار ہے کہ مانتے ہو تو مانتے رہو۔ تمھارے ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ ماننا تو درحقیقت ہمارا ماننا ہے اور ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اِس کا انکار ہی کریں گے۔ ہم اِس شخص کو ہرگز ماننے والے نہیں ہیں۔

۲۱۷؎ اصل میں لفظ 'عَتَوْا' آیا ہے اور اُس کے ساتھ 'عَنْ' کا صلہ ہے۔ اُس سے یہ سرکشی اور سرتابی، دونوں کے مفہوم پر متضمن ہو گیا ہے۔ اونٹنی کو مارنے کا جرم اگرچہ اُن کے ایک سرکش سردار نے کیا تھا، مگر قرآن نے اُسے پوری قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ باقی متمردین بھی اِس پر راضی تھے۔ یہ اونٹنی اُن کی سرکشی کو جانچنے کا ایک پیمانہ تھی۔ اِس کے مارنے سے واضح ہو گیا کہ اُنھیں مزید مہلت دی گئی تو اُن کا اگلا ہدف خود حضرت صالح ہوں گے۔

۲۱۸؎ اِس لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ زلزلے کا عذاب تھا۔ قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد پر آنے والے عذاب کی طرح یہ بھی رعد و برق کا عذاب تھا جس میں شمال کی بادِ صرصر کئی دنوں تک مسلط رہی اور

اَبۡلِغُکُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ وَ نَصَحۡتُ لَکُمۡ وَلٰکِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِیۡنَ ﴿۷۹﴾
وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مَا سَبَقَکُمۡ بِہَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ

گئے۔ اُس وقت[۴۱۹] صالح یہ کہتا ہوا اُنھیں چھوڑ کر چل دیا کہ میری قوم کے لوگو، میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تمھیں پہنچا دیا اور تمھاری بہت خیر خواہی کر دی، مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے[۴۲۰]۔ ۷۳-۷۹

(اِسی طرح) لوط کو بھیجا، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا[۴۲۱]: کیا اِس بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو[۴۲۲]؟ تم

بادلوں کی ہول ناک کڑک اور بہرا کر دینے والی چیخوں نے ہر چیز کو ہلا کر رکھ دیا۔ امام حمید الدین فراہی نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں اِس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

۴۱۹؎ یعنی عذاب سے ذرا پہلے جب قوم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترتیب بیان میں اِس بات کو عذاب کے ذکر کے بعد کیوں کر دیا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ ترتیب میں یہ تقدیم و تاخیر تقاضاے بلاغت سے ہوئی ہے۔ ارتکاب جرم اور اُس کے نتیجہ کے فوری ظہور کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں عذاب کو قتل ناقہ کے ساتھ متصل کر دیا اور حضرت صالح کی ہجرت کے ذکر کو پیچھے کر دیا۔ گویا جوں ہی اُنھوں نے ناقہ کو گزند پہنچا کر خدا کو چیلنج کیا، عذاب آ دھمکا۔ عذاب کی یہ سبقت و مبادرت اچھی طرح ظاہر نہ ہو سکتی، اگر اِس بیچ میں کوئی اور بات ذکر میں آ جاتی۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۰۵)

۴۲۰؎ کسی قوم کے بگاڑ کی یہی وہ آخری حد ہوتی ہے جس کے بعد اُس کی اصلاح کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اُس وقت خیر خواہ ہدف ملامت اور بد خواہ اُس کے لیڈر اور ہیرو بن جاتے ہیں۔

۴۲۱؎ حضرت لوط سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اُن کی قوم اُس علاقے میں رہتی تھی جو شام کے جنوب میں عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے اور آج کل شرق اردن کہلاتا ہے۔ بائیبل میں اُن کے سب سے بڑے شہر کا نام سدوم بتایا گیا ہے۔ پیچھے جن پیغمبروں کا ذکر ہوا ہے، اُنھیں قرآن نے 'اَخَاھُمۡ ھُوۡدًا' اور 'اَخَاھُمۡ صٰلِحًا' کے الفاظ سے اُن قوموں کی طرف منسوب فرمایا ہے، مگر لوط علیہ السلام کو اِس طرح منسوب نہیں فرمایا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لمبی مدت سے اُن کے اندر رہ تو رہے تھے، لیکن اُن کے اندر سے نہیں تھے۔ اُن کا تعلق اُس قوم کے ساتھ وہی تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قوم فرعون کے ساتھ تھا۔ آگے اُن کی بیوی کا ذکر جس اسلوب میں ہوا ہے، اُس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اُن کی شادی اُسی قوم کے اندر ہوئی تھی اور اِس لحاظ سے وہ اُنھی کے ایک فرد بن چکے تھے۔

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ

سے پہلے دنیا میں کسی (قوم) نے اِس کا ارتکاب نہیں کیا۔[۴۲۳] تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش

قوم لوط کے الفاظ قرآن میں اِسی بنا پر آئے ہیں۔

۴۲۲؎ یہ استفہام اظہارِ نفرت و کراہت کے لیے ہے اور آیت میں 'اَلْفَاحِشَة' کا لفظ بتا رہا ہے کہ بدکاری کی یہ صورت اُس قوم میں اِس درجہ عام تھی کہ متکلم اور مخاطب، دونوں نام لیے بغیر محض حرف تعریف سے سمجھ سکتے تھے کہ اِس سے کیا مراد ہے۔

۴۲۳؎ پہلے جملے کی طرح یہ جملہ بھی اظہارِ نفرت و کراہت کے لیے ہے اور اسلوب تعجب کا ہے۔ آیت میں 'مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ' کے جو الفاظ آئے ہیں، یہ افراد میں سے کسی فرد کے معنی میں بھی آ سکتے ہیں اور قوموں میں سے کسی قوم کے معنی میں بھی۔ یہاں قوم کے لیے ہیں اور استاذ امام کے الفاظ میں مدعا یہ ہے کہ تم سے پہلے کوئی شامت زدہ سوسائٹی ایسی نہیں گزری جس نے اِس غلاظت کو تمھاری طرح اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہو۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس برائی نے اُن کے اندر ایک فیشن اور تہذیبی روایت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اِس کے مرتکبین اپنی محافل میں برملا اِس کا اظہار کرتے اور اِس پر کوئی شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح توحید سے اپنی بات کی ابتدا کرنے کے بجائے لوط علیہ السلام نے سب سے پہلے اِسی پر تنبیہ فرمائی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...ایک برائی تو وہ ہوتی ہے، جو خواہ کتنی ہی سنگین ہو، لیکن وہ انسانی عوارض میں سے ہے اور انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے، دوسری برائی وہ ہے جس کا گھنونا پن اِس قدر واضح ہے کہ کسی انسان کے اندر عادت کی حیثیت سے اور کسی سوسائٹی کے اندر فیشن کی حیثیت سے اُس کا پایا جانا بغیر اِس کے ممکن نہیں کہ اُس انسان یا اُس سوسائٹی کی فطرت بالکل مسخ ہو گئی ہو۔ جہاں اِس طرح کے لوگوں سے سابقہ ہو، وہاں اصل قابل توجہ چیز وہی برائی ہوتی ہے، دوسری باتیں خواہ کتنی ہی اہمیت رکھنے والی ہوں، سب ثانوی درجے میں آ جاتی ہیں۔ آپ ایک شخص کے پاس اُس کی اصلاح کی غرض سے جائیں اور دیکھیں کہ وہ کھڑا ہوا غلیظ کھا رہا ہے تو آپ اُس کو ایمان و اسلام کی تلقین کریں گے یا سب سے پہلے اُس کی یہ عبرت انگیز حالت آپ کو متوجہ کرے گی؟ حضرت لوط علیہ السلام کو اِسی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ اُن کی قوم کے اندر شرک و کفر کی برائی بھی موجود تھی اور دوسری تمام برائیاں بھی، جو شرک و کفر کے لوازم میں سے ہیں، موجود تھیں، لیکن جن کی فطرت اتنی اوندھی ہو گئی ہو کہ مرد مردوں ہی کو

مُّسْرِفُوْنَ ﴿٨١﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ
اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٨٣﴾

پوری کرتے ہو۔ (حقیقت یہ ہے کہ تم بڑے اوندھے)، بلکہ بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔[۴۲۴] مگر اُس کی قوم نے جواب دیا تو یہ دیا کہ اِنھیں اپنی بستی سے نکالو، یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔[۴۲۵] سو ہم نے اُسے اور اُس کے گھر والوں کو بچا لیا،[۴۲۶] اُس کی بیوی کے سوا، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں رہ گئی۔[۴۲۷]

شہوت رانی کا محل بنائے ہوئے ہوں، اُن کو تو سب سے پہلے اِس غلاظت کی دلدل سے نکالنے کی ضرورت تھی، اُن سے کوئی دوسری بات کرنے کا مرحلہ تو بہرحال اِس کے بعد ہی آ سکتا تھا۔'' (تدبرقرآن ۳/ ۳۰۷)

۴۲۴؎ یہ تیسرا جملہ ہے جس سے لوط علیہ السلام نے اپنی نفرت و کراہت اور قوم کی دیوثیت پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے اِس مقصد کے لیے زن و مرد کے جوڑے پیدا کیے تھے۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر کس اوندھی فطرت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ پھر لڑکے تو لڑکے، تمھارے مرد تک اِسی لعنت میں گرفتار ہیں۔ یہ کیسا فساد طبیعت ہے جس نے تمھیں اِس مرض خبیث میں مبتلا کر دیا ہے؟ اِس قدر شدید نفرت و کراہت اور اظہار تعجب کی وجہ یہ ہے کہ زنا اپنے تمام مفاسد کے باوجود نفس انسانی کی بنیادی ترکیب میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا، لیکن یہ بیماری لاحق ہو جائے تو اِسی ترکیب میں خلل عظیم برپا کر دیتی ہے۔

۴۲۵؎ یہ کسی معاشرے کے بگاڑ کی آخری حد ہے جس تک پہنچ جانے کے بعد برائی تہذیب اور فیشن کا تقاضا اور نیکی باعث طعن بن جاتی ہے۔ لوگ یہ جاننے کے باوجود کہ پاکیزگی کیا ہے، اُسے اپنے اندر برداشت نہیں کرتے اور اُس کے علم برداروں کو اپنی بستیوں سے نکال پھینکنا چاہتے ہیں تاکہ جس طرح اُنھوں نے کپڑے اتار دیے ہیں، باقی سب بھی ننگے ہو جائیں اور کوئی یہ احساس دلانے والا نہ ہو کہ لباس بھی کوئی چیز ہوتی ہے جسے انسان کبھی پہنا کرتے تھے۔

۴۲۶؎ پیچھے 'اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ کچھ ایمان والے بھی تھے، مگر یہ آیت بتاتی ہے کہ یہ ایمان والے بھی اُن کے اہل و عیال ہی تھے۔ اُن سے باہر کا کوئی شخص اُن پر ایمان نہیں لایا۔

۴۲۷؎ یہ خدا کے بے لاگ انصاف کا اظہار ہے۔ لوط علیہ السلام کی بیوی غالباً اپنی قوم اور خاندان کی عصبیت کے

وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّطَرًا فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۸۴﴾

وَاِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاہُمۡ شُعَیۡبًا قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَیِّنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ فَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَالۡمِیۡزَانَ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِہَا ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۵﴾

اور اُس قوم پر (پتھروں کی) بارش برسا دی۔[۴۲۸] پھر دیکھو کہ اُن مجرموں کا کیا انجام ہوا۔ ۸۰-۸۴

اور مدین[۴۲۹] کی طرف اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اُس نے دعوت دی کہ میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھارے پاس ایک واضح حجت آ گئی ہے۔[۴۳۰] لہٰذا وزن اور پیمانے پورے رکھو، لوگوں کو اُن کی چیزیں گھٹا کر نہ دو[۴۳۱] اور زمین کی اصلاح کے بعد اُس میں فساد برپا نہ کرو۔[۴۳۲] تمھارے حق میں یہی بہتر ہے، اگر تم ایمان لائے ہوئے

باعث حق کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئی تو پیغمبر کی بیوی ہونا اُس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکا۔ حضرت نوح کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے باپ کی طرح وہ بھی اُسی انجام کو پہنچ گئی جو اُس کی قوم کے لیے مقرر ہو چکا تھا۔

۴۲۸؎ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کی قومیں بالعموم کنکر پتھر برسانے والی آندھی سے تباہ کی گئی ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ اِسے 'حَاصِب' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اُسی کا بیان ہے۔

۴۲۹؎ یہ بستی ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے مدیان کے نام پر مدین یا مدیان کہلاتی تھی، جو اُن کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے۔ اِس میں زیادہ تر اُنھی کی نسل آباد تھی۔ اِس کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا، مگر اِس کا کچھ سلسلہ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ اُس زمانے کی دو بڑی تجارتی شاہراہیں اِسی علاقے سے گزرتی تھیں، اِس وجہ سے مدین کے لوگوں نے بھی تجارت میں بہت ترقی کر لی تھی۔

۴۳۰؎ یعنی خدا کے پیغمبر کی دعوت جو اپنے ساتھ خدا کی معیت کے ناقابل تردید شواہد لے کر آتی ہے۔ اِسے واضح حجت اِسی بنا پر کہا ہے۔

۴۳۱؎ یہ چونکہ تجارت پیشہ قوم تھی، اِس لیے اِس کے باطنی فساد کا ظہور ناپ تول میں خیانت کی صورت میں بھی

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا
عِوَجًا وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾
وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا
حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا

ہو۔[۴۳۳] اور نہ ہر راستے پر بیٹھو کہ لوگوں کو ڈرانے، ایمان والوں کو خدا کی راہ سے روکنے اور اُس میں عیب ڈھونڈنے لگو۔[۴۳۴] یاد کرو، جب تم تھوڑے تھے، پھر خدا نے تمھیں بڑھا دیا اور دیکھو کہ اُن لوگوں کا انجام کیا ہوا جو فساد کرنے والے تھے۔[۴۳۵] اگر تم میں سے ایک گروہ اُس چیز پر ایمان لے آیا ہے جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔[۴۳۶] اُس کی قوم کے بڑوں نے، جو متکبر ہو چکے تھے،

ہوا۔ یہ اِس بات کی علامت تھی کہ پوری قوم کے اندر عدل و قسط کا تصور مختل ہو چکا اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کا عقیدہ باقی نہیں رہا۔

۴۳۲؎ یعنی خدا کے مقابلے میں سرکشی اور تمرد اختیار نہ کرو، جبکہ رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد خدا کی زمین کو یہ رویہ اختیار کرنے والوں سے کئی مرتبہ پاک کر کے اُس کی اصلاح کی جا چکی ہے۔

۴۳۳؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ مدین کے لوگ نہ صرف یہ کہ حضرت ابراہیم کے خاندان سے نسبت رکھتے تھے، بلکہ نبیوں کی تعلیم کے حامل ہونے کے مدعی بھی تھے۔ یہ ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم تھی اور شعیب علیہ السلام کی بعثت کے وقت اِس کی حالت وہی تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے ظہور کے وقت بنی اسرائیل کی حالت تھی۔

۴۳۴؎ یہ اُن سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے جو اُس قوم کے اشرار شعیب علیہ السلام کے ساتھیوں کو ڈرانے دھمکانے اور ایمان کی راہ سے روکنے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔

۴۳۵؎ یعنی خدا کی نعمتوں پر اُس کا شکر ادا کرو اور پیغمبر کی دعوت کے جواب میں وہ رویہ اختیار نہ کرو جو تم سے پہلی قوموں نے اختیار کیا تھا۔ اُن کا انجام پیش نظر رکھو کہ جب وہ خدا اور اُس کے رسولوں کے مقابلے میں سرکشی پر اتر آئے تو کس طرح تباہ و برباد کر دیے گئے۔

مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ
مِلَّتِنَا قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِافْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ
مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ
رَبُّـنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا

اُس سے کہا کہ اے شعیب، ہم تمھیں اور (تمھارے) اُن لوگوں کو جو تمھارے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی اِس بستی سے نکال باہر کریں گے یا تم کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔ اُس نے جواب دیا: کیا اُس صورت میں بھی کہ ہم (اُس سے) بے زار ہوں؟ اگر ہم تمھاری ملت میں لوٹ آئیں، اِس کے بعد کہ اللہ ہمیں اُس سے نجات دے چکا ہے تو (اِس کے معنی یہ ہیں کہ) ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے[۴۳۷]۔ (نہیں)، یہ ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کہ ہم اُس میں لوٹ آئیں، الاّ یہ کہ اللہ، ہمارا پروردگار ہی چاہے۔ ہمارے پروردگار کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے[۴۳۸]۔ ہم نے اللہ پر بھروسا کیا ہے۔ پروردگار، ہمارے

۴۳۶؎ مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ ایمان لے آئے ہیں اور کچھ نہیں لائے تو کیا بعید ہے کہ جو ایمان نہیں لائے، اُن کو بھی اللہ تعالیٰ توفیق دے اور وہ ایمان کی نعمت سے بہرہ یاب ہو جائیں۔ لہٰذا عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ تمھیں یہ مہلت اِسی توقع کے پیش نظر ملی ہوئی ہے۔ پیغمبر کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تو ہر حال میں صادر ہونا ہے۔ ذرا صبر کرو، ابھی کچھ بلونے اور پھٹکنے کا کام باقی ہے۔ یہ ہو جائے گا تو خدا کا فیصلہ بھی اپنے وقت پر اور ٹھیک انصاف کے ساتھ صادر ہو جائے گا۔

۴۳۷؎ یعنی اِس وقت جو کچھ کہہ رہے اور جن حقائق پر اپنے ایمان کا اظہار کر رہے ہیں، وہ محض جھوٹ اور افترا ہے۔ ہم تمھاری ملت کی طرف لوٹتے ہیں تو اِس کے معنی یہی ہوں گے۔ حالاں کہ جھوٹ اور افترا کا مجموعہ تمھاری یہ ملت ہے۔ حق وصداقت کو چھوڑ کر ہم اِس کی طرف کیسے لوٹ سکتے ہیں۔ ہم تو آخری درجے میں اِس سے بے زار ہیں۔ شعیب علیہ السلام نے یہ جواب اپنے ساتھیوں کی طرف سے بھی دیا ہے، اِس لیے فرمایا ہے کہ 'بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا' ورنہ انبیا علیہم السلام تو بعثت سے پہلے بھی ہدایت فطرت پر ہوتے ہیں۔

۴۳۸؎ یہ تفویض الی اللہ کے جملے ہیں۔ بندۂ مومن عزم و جزم کے ساتھ کسی فیصلے کا اظہار تو کر سکتا ہے، مگر اِس

بِالۡحَقِّ وَاَنۡتَ خَیۡرُ الۡفٰتِحِیۡنَ ﴿۸۹﴾ وَقَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ لَئِنِ
اتَّبَعۡتُمۡ شُعَیۡبًا اِنَّکُمۡ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتۡہُمُ الرَّجۡفَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ
دَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا شُعَیۡبًا کَاَنۡ لَّمۡ یَغۡنَوۡا فِیۡہَا اَلَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا شُعَیۡبًا
کَانُوۡا ہُمُ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۹۲﴾ فَتَوَلّٰی عَنۡہُمۡ وَقَالَ یٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُکُمۡ رِسٰلٰتِ

اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے، تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اُس کی قوم کے بڑوں نے، جو انکار کا فیصلہ کر چکے تھے، (لوگوں کو) تنبیہ کی کہ شعیب کی پیروی کرو گے تو بڑے خسارے میں پڑو گے۔[۴۳۹] آخر ایک سخت تھرتھراہٹ[۴۴۰] نے اُنھیں آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا، وہ ایسے تھے کہ گویا اُس بستی میں کبھی بسے ہی نہیں تھے۔ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا، بالآخر وہی نامراد ہوئے۔[۴۴۱] اُس وقت شعیب یہ کہتا ہوا اُنھیں چھوڑ کر

حقیقت سے کبھی غافل نہیں ہوسکتا کہ خدا کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے۔ اُس کا علم ماضی، حال اور مستقبل کے تمام معاملات پر حاوی ہے۔ صرف وہی جانتا ہے کہ کس کے لیے کیا مقدر ہے اور کس کا انجام کیا ہونا ہے۔ لہٰذا اُس کے نیک ارادوں کا پورا ہونا بھی خدا کی مشیت پر موقوف ہے۔ وہ توفیق بخشے گا تو کامیابی حاصل ہوگی، ورنہ ہر شخص ناکام رہ جائے گا۔

۴۳۹؎ اِس میں تنبیہ و تہدید بھی ہے اور ہمدردی کی نمایش بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے نیک و بد تمھیں سمجھا دیا ہے۔ اِس کے بعد بھی نہیں مانتے ہو تو قوم کے زعما اور لیڈروں کو چھوڑ کر اِس شخص کی پیروی کے نتائج عنقریب بھگت لو گے۔

۴۴۰؎ یہ مجرد عذاب کی تعبیر ہے۔ اِس کی تفصیل ہم پیچھے قوم صالح کی سرگذشت میں بیان کر چکے ہیں۔

۴۴۱؎ یہ عذاب کا نتیجہ بیان ہوا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

’’...اِس کے دونوں فقروں میں اُن دونوں دھمکیوں کی طرف تلمیح ہے جو قوم شعیب علیہ السلام کے کفار نے حضرت شعیب علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کو دی تھیں۔ اُنھوں نے دھمکی دی تھی کہ ہم تم کو اپنی بستی سے نکال کر چھوڑیں گے۔ اِس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ خود اِس دیار سے اِس طرح مٹے: گویا کہ اِن تلوں

رَبِّیۡ وَنَصَحۡتُ لَکُمۡ فَکَیۡفَ اٰسٰی عَلٰی قَوۡمٍ کٰفِرِیۡنَ ﴿۹۳﴾

چل دیا کہ میری قوم کے لوگو، میں نے اپنے پروردگار کے پیغامات تمھیں پہنچا دیے اور تمھاری خیر خواہی کر دی[۲۴۴]۔ اب میں منکروں پر افسوس کیا کروں!! ۸۵-۹۳

میں کبھی تیل ہی نہ تھا۔ اُنھوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھیوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم اِس شخص کی پیروی سے دست کش نہ ہوئے تو بڑے خسارے میں پڑو گے۔ اِس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا، وہی خسارے میں پڑے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۳۱۴)

۲۴۴؎ یہی مضمون اوپر قوم صالح کی سرگذشت میں بھی گزر چکا ہے۔ ہم نے وہاں اِس کی وضاحت کر دی ہے۔

[باقی]

محمد رفیع مفتی

اذکار و ادعیہ مسنونہ

(۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اذکار اور دعائیں منقول ہیں، ذیل میں ان سے متعلق احادیث لائی گئی ہیں۔ یہ اذکار اور دعائیں ہمیں اس لیے سکھائی گئی ہیں تاکہ ہمارا دل ہر وقت خدا کی یاد سے معمور رہے۔ انسان کا دل، بلاشبہ خدا کی یاد ہی سے زندہ رہتا ہے اور جس دل میں اس کی یاد نہ ہو، وہ مردہ ہوتا ہے۔ دل کی اس زندگی ہی کو انسان کی روحانی زندگی کہا جاتا ہے۔ جیسے ہماری مادی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ ہم سانس لیتے رہیں، اسی طرح ہماری روحانی زندگی کے لیے خدا کی یاد میں مداومت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بھی اللہ کے ذکر کی بہت تاکید کی گئی ہے اور احادیث شریفہ میں بھی اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔

ان احادیث میں مختلف اذکار پر آخرت میں جس عظیم اجر کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلمات انسان کے ذہن و قلب میں خدا کی اس یاد کو مستحضر کرتے ہیں جو اس کے شعور کو ترقی، نفس کو پاکیزگی اور روح کو بالیدگی عطا کرتی ہے اور پھر اس کے نتیجے میں وہ خدا کی اس خالص بندگی کو عملاً اپنا لیتا ہے جس کے لیے وہ تخلیق کیا گیا ہے۔

(۸۷)

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَأَنْ أَقُوْلَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَکْبَرُ أَحَبُّ إِلَیَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَیْهِ الشَّمْسُ. (مسلم، رقم ۶۸۴۷)

حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے 'سُبُحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمُدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكُبَرُ ' (اللہ پاک ہے، سارا شکر اللہ ہی کے لیے ہے، اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے) کہنا ان سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے۔

(۸۸)

عَنُ أَبِی هُرَيُرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنُهُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنُ قَالَ: سُبُحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمُدِهِ فِی يَوُمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ حُطَّتُ خَطَايَاهُ وَإِنُ كَانَتُ مِثُلَ زَبَدِ الْبَحُرِ. (بخاری، رقم ۶۴۰۵)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے دن میں سو مرتبہ 'سُبُحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمُدِهِ ' (اللہ پاک ہے اور ستودہ صفات ہے) کہا، اس کے سارے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، اگر چہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔

(۸۹)

عَنُ أَبِی هُرَيُرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ: مَنُ قَالَ حِينَ يُصُبِحُ وَحِينَ يُمُسِی سُبُحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمُدِهِ مِائَةَ مَرَّةٍ لَمُ يَأُتِ أَحَدٌ يَوُمَ الْقِيَامَةِ بِأَفُضَلَ مِمَّا جَاءَ بِهِ إِلَّا أَحَدٌ قَالَ مِثُلَ مَا قَالَ أَوُ زَادَ عَلَيُهِ. (مسلم، رقم ۶۸۴۳)

حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے صبح اور شام 'سُبُحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمُدِهِ ' (اللہ پاک ہے اور ستودہ صفات ہے) کہا تو قیامت کے دن کوئی

شخص اس سے افضل عمل لانے والا نہ ہوگا، سوائے اس کے جس نے یہی کلمات کہے ہوں گے یا انھی پر کچھ اضافہ کیا ہوگا۔

(۹۰)

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: كَلِمَتَانِ خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ حَبِیْبَتَانِ إِلَی الرَّحْمٰنِ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ. (بخاری، رقم ۶۶۸۲۔ مسلم، رقم ۶۸۴۶)

حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو کلمے ہیں جو زبان پر ہلکے، میزان میں بھاری اور اللہ کو بہت محبوب ہیں، یہ کلمے ’سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ‘ (اللہ پاک ہے اور ستودہ صفات ہے، اللہ پاک ہے عظمت والا) ہیں۔

(۹۱)

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ فِیْ یَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ كَانَتْ لَهُ عَدْلَ عَشْرِ رِقَابٍ وَكُتِبَتْ لَهُ مِائَةُ حَسَنَةٍ وَمُحِیَتْ عَنْهُ مِائَةُ سَیِّئَةٍ وَكَانَتْ لَهُ حِرْزًا مِّنَ الشَّیْطَانِ یَوْمَهُ ذٰلِكَ حَتّٰی یُمْسِیَ وَلَمْ یَأْتِ أَحَدٌ بِأَفْضَلَ مِمَّا جَاءَ بِهِ إِلَّا أَحَدٌ عَمِلَ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ. (بخاری، رقم ۳۲۹۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ’لَا

اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ' (اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں؛ وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں؛ بادشاہی اس کی ہے اور حمد بھی اسی کے لیے ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) کہے، اس کے لیے دس غلاموں کو آزاد کرنے کے برابر اجر ہوتا ہے، سو نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں، اس کے سو گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور اس دن شام تک وہ شیطان سے (اللہ کی) پناہ میں ہوتا ہے۔ (قیامت کے دن) کوئی شخص بھی اس سے افضل عمل والا نہ ہوگا، سوائے اس کے جس نے یہی ذکر اس سے زیادہ کیا ہوگا۔

(۹۲)

عَنْ اَبِىْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ ... اَشْرَفَ النَّاسُ عَلٰى وَادٍ فَرَفَعُوْا اَصْوَاتَهُمْ بِالتَّكْبِيْرِ: اَللّٰهُ اَكْبَرُ اللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ارْبَعُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِبًا اِنَّكُمْ تَدْعُوْنَ سَمِيْعًا قَرِيْبًا وَهُوَ مَعَكُمْ وَاَنَا خَلْفَ دَابَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَنِىْ وَاَنَا اَقُوْلُ: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ فَقَالَ لِىْ: يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ قَيْسٍ، قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ: اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى كَلِمَةٍ مِّنْ كَنْزٍ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ؟ قُلْتُ: بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَدَاكَ اَبِىْ وَاُمِّىْ، قَالَ: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ. (بخاری، رقم ۴۲۰۵)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ... (کسی سفر کے دوران میں) لوگ ایک وادی میں داخل ہوئے اور بلند آواز سے کلمۂ تکبیر 'اَللّٰهُ اَكْبَرُ اللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ' (اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں) کہنے لگے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: اپنی آوازوں کو پست کرو، تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو، تم اسے پکار رہے ہو جو سننے والا ہے، قریب ہے اور تمھارے ساتھ ہے۔ (ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ) میں (اس وقت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کے پیچھے تھا، تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے 'لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ' (ہمت اور قدرت، سب اللہ ہی کی عنایت سے ہے) کہتے ہوئے سنا، تو آپؐ نے مجھ سے کہا: اے عبداللہ بن قیس، میں نے کہا: لبیک یا رسول اللہ (میں حاضر ہوں اے اللہ کے رسول)، آپؐ نے فرمایا: کیا میں تمھیں وہ کلمہ نہ بتاؤں جو جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ نے فرمایا: 'لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ' (ہمت اور قدرت، سب اللہ ہی کی عنایت سے ہے)۔

(۹۳)

عَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَيِّدُ الإِسْتِغْفَارِ أَنْ تَقُوْلَ: أَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَأَنَا عَبْدُكَ وَأَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأَبُوْءُ لَكَ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ قَالَ: وَمَنْ قَالَهَا مِنَ النَّهَارِ مُوْقِنًا بِهَا فَمَاتَ مِنْ يَوْمِهِ قَبْلَ أَنْ يُّمْسِيَ فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَمَنْ قَالَهَا مِنَ اللَّيْلِ وَهُوَ مُوْقِنٌ بِهَا فَمَاتَ قَبْلَ أَنْ يُّصْبِحَ فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ. (بخاری، رقم ۶۳۰۶)

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سید الاستغفار دعا یہ ہے:

اے اللہ، تو میرا پروردگار ہے؛ تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں؛ تو نے مجھے پیدا کیا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور اپنی استطاعت کے مطابق تیرے عہد اور وعدے پر قائم ہوں؛ میں اپنے اعمال کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں؛ اپنے اوپر تیری نعمتوں کا اعتراف اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں؛ تو مجھے بخش دے، اس لیے کہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو معاف نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی یقین کے ساتھ یہ دعا دن میں کرے اور اسی دن شام سے پہلے دنیا سے رخصت ہو جائے تو اس کے لیے جنت ہے اور جو یقین کے ساتھ رات میں کرے اور صبح سے پہلے رخصت ہو جائے تو اس کے لیے بھی جنت ہے۔

(۹۴)

عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَوٰى إِلٰى فِرَاشِهِ قَالَ: بِاسْمِكَ أَمُوتُ وَأَحْيَا وَإِذَا قَامَ قَالَ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورُ. (بخاری، رقم ۶۳۱۲۔ مسلم، رقم ۶۸۸۷)

حضرت حذیفہ بن یمان (رضی اللہ عنہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ جب اپنے بستر پر لیٹتے تو کہتے: اے اللہ، میں تیرے نام ہی سے مرتا اور زندہ ہوتا ہوں، اور جب آپ بیدار ہوتے تو کہتے: اس اللہ ہی کے لیے شکر ہے جس نے ہم کو موت کے بعد پھر زندگی عطا فرمائی اور (ایک دن) اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

(۹۵)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَمْسٰى قَالَ: أَمْسَيْنَا وَأَمْسَى الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، أَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرِ مَا فِيهَا وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا

وَشَرِّ مَا فِيهَا، أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ الْكَسَلِ وَالْهَرَمِ وَسُوْءِ الْكِبَرِ وَفِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ.

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ رَفَعَهُ، أَنَّهُ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. (مسلم، رقم ۶۹۰۹)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شام کے وقت یہ دعا کیا کرتے: ہم نے شام کی اور خدا کی بادشاہی بھی شام میں داخل ہو گئی ہے۔ شکر اللہ کے لیے ہے اور اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں؛ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اے اللہ، میں اس رات کی بھلائی چاہتا ہوں اور اس کی بھی جو اس میں ہے؛ اور رات کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اس سے بھی جو اس میں ہے۔ اے اللہ، میں سستی سے، بڑھاپے سے، بڑھاپے کی برائی سے، دنیا کی آزمایش سے اور قبر کے عذاب سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

حضرت عبداللہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں؛ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں؛ بادشاہی اس کی ہے اور حمد بھی اسی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(۹۶)

عَنِ الْبَرَّاءِ بْنِ عَازِبٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا أَخَذْتَ مَضْجَعَكَ فَتَوَضَّأْ وُضُوْءَكَ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلٰى شِقِّكَ الْأَيْمَنِ ثُمَّ قُلْ: أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيْ إِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ أَمْرِيْ إِلَيْكَ وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِيْ إِلَيْكَ رَغْبَةً وَرَهْبَةً إِلَيْكَ لَا مَلْجَأً وَلَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ

أَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِیْ أَرْسَلْتَ وَاجْعَلْهُنَّ مِنْ آخِرِ كَلَامِكَ فَإِنْ مُتَّ مِنْ لَيْلَتِكَ مُتَّ وَأَنْتَ عَلَى الْفِطْرَةِ...وَإِنْ أَصْبَحَ أَصَابَ خَيْرًا.

(مسلم، رقم ۶۸۸۲-۶۸۸۳)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم سونے لگو تو اپنا نماز والا وضو کرو، پھر اپنے دائیں پہلو پر لیٹو اور کہو: اے اللہ، میں نے اپنے آپ کو تیرے حوالے کر دیا ہے اور اپنا معاملہ تیرے سپرد کر دیا ہے اور تجھ سے ٹیک لگا لی ہے، تیری عظمت سے لرزتے ہوئے اور تیرے اشتیاق میں بڑھتے ہوئے۔ تجھ سے بھاگ کر کہیں پناہ اور کہیں ٹھکانا نہیں، اور اگر ہے تو تیرے ہی پاس ہے۔ (پروردگار) میں تیری کتاب پر ایمان لایا ہوں جو تو نے نازل کی ہے اور تیرے نبی پر ایمان لایا ہوں جسے تو نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ (آپ نے فرمایا): تم کوشش کرو کہ سونے سے پہلے تمھارے آخری کلمات یہی ہوں، پھر اگر تم اسی رات وفات پا گئے تو تمھاری موت فطرت (اسلام) پر ہوگی...اور اگر صبح بیدار ہوئے تو خیر پر بیدار ہو گے۔

(۹۷)

عَنْ سُهَيْلٍ قَالَ: كَانَ أَبُوْ صَالِحٍ يَأْمُرُنَا إِذَا أَرَادَ أَحَدُنَا أَنْ يَّنَامَ أَنْ يَّضْطَجِعَ عَلٰى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ ثُمَّ يَقُوْلُ: أَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمَاوَاتِ وَرَبَّ الْأَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَیْءٍ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰی وَمُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْفُرْقَانِ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَیْءٍ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، أَللّٰهُمَّ أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَیْءٌ وَأَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَیْءٌ وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَیْءٌ وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَیْءٌ اقْضِ عَنَّا الدَّيْنَ وَأَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ.

(مسلم، رقم ۶۸۸۹)

حضرت سہیل (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ حضرت ابو صالح ہمیں حکم دیتے کہ جب ہم میں سے کوئی سونے کا ارادہ کرے تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹے اور کہے: اے اللہ، آسمانوں کے پروردگار، زمین کے پروردگار اور عرش عظیم کے پروردگار، ہمارے پروردگار اور ہر چیز کے پروردگار؛ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے، تورات وانجیل اور فرقان کے نازل کرنے والے؛ میں ان سب چیزوں کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں جن کی پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ اے اللہ، تو اول ہے، تجھ سے پہلے کوئی چیز نہیں اور تو آخر ہے، تیرے بعد کوئی چیز نہیں؛ تو ظاہر ہے، تیرے اوپر کوئی چیز نہیں اور تو باطن ہے، تیرے نیچے کوئی چیز نہیں۔ تو ہمارے قرض ادا فرما اور ہماری محتاجی کو دور کر کے ہمیں غنی کر دے۔

[باقی]

محمد وسیم اختر مفتی

حسن رضی اللہ عنہ

ہمارے پیارے نبی کے نواسے، حضرت علی اور سیدہ فاطمہ کے بڑے بیٹے حضرت حسن ۱۵ رمضان ۳ھ (یکم اپریل ۶۲۵ء) کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔

حضرت علی فرماتے ہیں، جب حسن پیدا ہوئے تو میں نے ان کا نام حرب رکھا۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے نواسے کو دیکھنے کے لیے ہمارے گھر) تشریف لائے اور کہا، مجھے اپنا بیٹا تو دکھاؤ، تم نے اس کا کیا نام رکھا ہے؟ ہم نے بتایا، حرب۔ آپ نے فرمایا، نہیں! اس کا نام حسن ہونا چاہیے۔ پیدائش کے ساتویں دن آپ نے حسن کا عقیقہ ادا فرمایا، دو مینڈھوں کی قربانی دی، سر منڈایا اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی خیرات کی۔ عباس بن عبدالمطلب کی اہلیہ ام الفضل نے اپنے بیٹے قثم کے ساتھ حسن کو بھی دودھ پلایا تھا یوں قثم حسن کے چچا ہونے کے ساتھ ان کے رضاعی بھائی بھی بن گئے۔ حسن کی کنیت ابومحمد تھی، یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمائی تھی اگرچہ اس نام کا ان کوئی فرزند نہ تھا۔ مجتبیٰ اور سبط ان کے القاب ہیں۔ حسن سر اور جسم کے اوپری حصے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کافی مشابہت رکھتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسن سے بہت محبت کرتے تھے جو کم وبیش آٹھ سال تک آپ کی آغوش میں رہے۔ اکثر ان کو گلے لگاتے، چومتے اور ان کے ساتھ کھیل کود کرتے۔ شداد بن ہاد روایت کرتے ہیں، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر یا عصر کی نماز پڑھانے تشریف لائے۔ آپ نے حسن یا حسین کو اٹھا رکھا تھا۔ انھیں بٹھا کر آپ نے نماز پڑھانی شروع کی۔ نماز کے دوران میں آپ سجدے میں گئے تو اسے خوب لمبا کر دیا۔ راوی کہتے ہیں، میں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ وہ بچہ آپ کی کمر پر بیٹھا ہے اور آپ سجدے میں ہیں۔ میں نے سر نیچے کر لیا۔ نماز کے بعد صحابہ نے

کہا، یارسول اللہ! ہم نے سمجھا، کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے یا آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ فرمایا، یہ دونوں باتیں نہیں ہوئیں بلکہ میرے بیٹے نے مجھے سواری بنا لیا تو میں نے اچھا نہیں سمجھا کہ اس کی خواہش پوری ہونے سے پہلے جلدی مچاؤں۔ ابو بریدہ کہتے ہیں، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں خطبہ ارشاد کر رہے تھے کہ حسن و حسین سرخ قمیصیں پہنے ہوئے، چلتے ہوئے، گرتے ہوئے مسجد نبوی میں داخل ہوئے۔ آپ منبر سے اتر آئے، انھیں اٹھایا اور اپنے سامنے بٹھا لیا پھر فرمایا' اللہ کا ارشاد سچ ہے ''بے شک تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھارے لیے آزمایش ہیں'' (سورۂ انفال: ۲۸، سورۂ تغابن: ۱۵) میں نے ان بچوں کو چلتے اور گرتے دیکھا تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا، اپنا وعظ روکا اور انھیں اٹھا لیا۔ آپ کا ارشاد ہے، ''حسن و حسین جوانان جنت کے سردار ہیں۔'' فرمایا، ''حسن و حسین دنیا میں موجود جنت کے پھول ہیں۔''

عربی میں چھوٹے بچے کے لیے 'لُکَع' کا لفظ آتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں۔ ایک دن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بنو قینقاع کے بازار گیا، ہم نے یہ راستہ خاموشی سے طے کیا۔ آپ واپس آئے تو حضرت فاطمہ کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر پکارنے لگے، کیا یہاں لُکَع ہے؟ کیا یہاں لُکَع ہے؟ مراد حسن تھے۔ جواب نہ ملا تو ہم سمجھے، ان کی والدہ نے ان کو اس لیے روک رکھا ہے کہ نہلا کر لونگ کا ہار پہنائیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہ دوڑتے ہوئے باہر آئے، نانا نواسہ دونوں نے باہم معانقہ کیا۔ تب آپ نے دعا فرمائی، ''اے اللہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے اور اس کے پسندیدہ لوگوں سے محبت کر۔'' آپ نے فرمایا، ''جو جنت کے جوانوں کے سرخیل کو دیکھنا چاہتا ہے، حسن (دوسری روایت: حسین) کو دیکھ لے''۔ عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں، ایک دفعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کو کاندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ ایک صحابی نے کہا، لڑکے! تو بڑی اچھی سواری پر سوار ہوا ہے۔ آپ نے جواب فرمایا، ہاں سوار بھی بہت خوب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ بتاتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن بن علی کو چوما۔ اقرع بن حابس تمیمی پاس بیٹھے تھے، انھوں نے کہا، میرے دس بیٹے ہیں، میں نے کبھی کسی کو نہیں چوما۔ آپ نے انھیں (تعجب سے) دیکھا اور فرمایا، جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا''۔

خلیفۂ اول ابوبکر عصر کی نماز پڑھا کر نکلے تو دیکھا کہ حسن بچوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ انھوں نے ان کو اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا اور کہا، اس کی شکل نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی ہے، علی سے نہیں۔ علی مسکرا دیے۔

عبداللہ بن جعفر بتاتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سفر سے واپس آتے تو گھر کے بچوں کو لے جا کر آپ کا استقبال کیا جاتا۔ ایک بار آپ سفر سے لوٹے تو مجھے لے جا کر آپ کے آگے بٹھا دیا گیا، سیدہ فاطمہ کے بیٹوں حسن

وحسین میں سے ایک کو پیچھے بٹھایا گیا۔ ہم تینوں ایک ہی سواری پر سوار ہو کر مدینہ میں داخل ہوئے۔ ایسا ہی واقعہ ہے جو سلمہ بن اکوع نے روایت کیا، ایک بار میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید خچر کو نکیل سے پکڑ کر حجرۂ نبوی تک لایا۔ اس پر آپ سوار تھے، حسن وحسین میں سے ایک آگے اور ایک پیچھے بیٹھا تھا۔

کھجور کی نئی فصل آتی تو ہر شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجور لاتا اس طرح مسجد نبوی میں ڈھیر لگ جاتا۔ ننھے حسن وحسین ان کھجوروں سے کھیلتے۔ ان میں سے ایک نے کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ آپ نے دیکھا تو کھجور نکال کر فرمایا، ''کیا تو جانتا نہیں کہ آل محمد صدقہ نہیں کھاتی''۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حسن وحسین کے لیے اللہ کی پناہ میں آنے کی دعا کرتے تھے۔ آپ فرماتے، تمھارے باپ، ابراہیم علیہ السلام یہ کلمات پڑھ کر اپنے بیٹوں اسماعیل واسحاق علیہما السلام کو اللہ کی پناہ میں لاتے تھے، اعوذ بکلمات اللّٰہ التامة من کل شیطان و ھامة و من کل عین لامة ، میں اللہ کے کامل کلمات کے ذریعے ہر شیطان، ہر زہریلے کیڑے اور ہر نظر بد سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

اسامہ بن زید بتاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اور حسن کو اٹھاتے، ایک ران پر مجھے اور دوسری پر حسن کو بٹھاتے پھر اپنے ساتھ چپکا لیتے اور دعا فرماتے، ''اے اللہ! ان دونوں پر رحم کر، میں بھی ان پر رحم کرتا ہوں''۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور حسن کو پہلو میں بٹھا لیا، پھر آپ نے باری باری ہر فرد کو مخاطب کر کے فرمایا، ''میرا یہ بیٹا سردار ہوگا۔ امید ہے کہ اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا''۔

۱۰ھ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور مباہلہ کرنے کو کہا۔ آپ علی، فاطمہ حسن اور حسین کو لے کر نکلے۔ عیسائیوں نے ان نفوس قدسیہ کو دیکھا اور کہا، یہ ایسے چہرے ہیں کہ اگر اللہ کے نام پر قسم کھالیں کہ وہ پہاڑوں کو سرکا دے تو وہ ضرور سرکا دے گا۔ آخرکار وہ مباہلہ کرنے کے بجائے آپ سے صلح کر کے چلے گئے۔

کم سنی کے باوجود حسن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے خطبات وارشادات گھر آ کر اپنی والدہ سیدہ فاطمہ کے سامنے دہراتے۔ ایک مرتبہ حضرت علی ان کی باتیں سننے بیٹھ گئے تو ان کی زبان میں قدرے لکنت آ گئی۔

عہد صدیقی میں امہات المومنین نے حضرت عثمان کو حضرت ابوبکر کے پاس بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مال فے چھوڑا ہے اس کا آٹھواں حصہ انھیں دیا جائے۔ سیدہ عائشہ نے انھیں منع کیا اور کہا، کیا تم نہیں جانتیں

کہ آپ فرمایا کرتے تھے، ''ہم پیغمبروں کا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہمارا ترکہ صدقہ ہوتا ہے''۔ اس سے آپ کی مراد اپنی ذات (اور امہات المومنین) تھی البتہ آپ کی اولاد (بقدر ضرورت) یہ مال کھا سکتی ہے۔ یہ مال صدقہ حضرت علی کے قبضہ میں آیا تو انھوں نے عباس کو نہ لینے دیا۔ ان کے بعد حسن، حسین پھر علی بن حسین (زین العابدین) اور حسن بن حسن (حسن مثنیٰ) کی تحویل میں آیا۔ یہ دونوں اس کا انتظام کرتے رہے۔ آخر کار زید بن حسن کے پاس اس طرح آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ ہے۔

۱۵ھ میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر نے اسلامی مملکت کے شہریوں کے لیے وظائف مقرر کرنے کے لیے دیوان ترتیب دیا۔ انھوں نے حضرت حسن، حضرت حسین، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی کا حصہ بدری صحابہ جتنا یعنی ۵ ہزار درہم سالانہ رکھا حالانکہ حسن و حسین بدر کے موقع پر پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ یہ رقم ۱۵ھ سے لے کر ۴۰ھ تک انھیں ملتی رہی۔ اس دیوان میں پہلا نام عباس، دوسرا علی اور تیسرا حسن کا تھا۔

عہد عثمانی میں حسن جوان ہو چکے تھے۔ اس عہد کے ساتویں سال ۳۰ھ میں سعید بن عاص نے طبرستان پر فوج کشی کی۔ ان کے لشکر میں حسن، حسین، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو، حذیفہ بن یمان اور عبداللہ بن زبیر جیسے جلیل القدر اصحاب رسول شامل تھے۔

ولید بن عقبہ کو حضرت عثمان کے پاس لایا گیا کہ اس نے صبح کی دو رکعتیں پڑھانے کے بعد (نشے کی حالت میں) لوگوں سے پوچھا، کیا اور پڑھاؤں؟ ایک شخص حمران نے اس کے خلاف شہادت دی کہ اس نے شراب پی رکھی تھی، دوسرے کی گواہی تھی کہ اس نے اسے قے کرتے دیکھا ہے۔ الزام ثابت ہو گیا تو عثمان نے علی سے کہا، اسے کوڑے لگاؤ، انھوں نے حسن کو کہہ دیا۔ حسن کا جواب تھا، امور خلافت میں سے مشکل (اور گرم) کام اسی کو دیں جس نے آسان (اور ٹھنڈے) کام اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ یہ ان کا حضرت عثمان سے اظہار ناراضی تھا۔ تب عثمان نے عبداللہ بن جعفر کو کہا اور انھوں نے کوڑے لگائے، علی نے چالیس تک گنتی پوری کی۔

۳۵ھ میں حضرت عثمان کے خلاف شورش ہوئی تو حضرت علی نے اپنے لخت جگر حسن کو ان کی حفاظت کے لیے مامور کیا۔ عثمان نے اہل مدینہ کو لوٹا دیا تو بھی حسن، ابن عباس، محمد بن طلحہ اور عبداللہ بن زبیر ان کے گھر کے باہر موجود رہے۔ خود حضرت عثمان کے اصرار پر ابن عباس امیر حج بن کر مکہ چلے گئے تو باقی جوانوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ بلوائی گھر کے دروازے تک نہ جا سکیں۔ اس مدافعت میں حسن زخمی بھی ہوئے، ان کا بدن خون سے رنگین ہو گیا۔ سیدنا عثمان نے قسم دے کر حسن کو جانے کو کہا لیکن وہ نہ ٹلے۔ باغی اس دروازے سے داخل نہ ہو سکے جہاں حسن کا پہرہ تھا

تاہم، وہ دوسری دیوار پھاند کر گھر کے اندر جانے میں کامیاب ہو گئے۔ خلیفۂ مظلوم کی شہادت کے بعد علی جائے وقوعہ پر پہنچے تو اپنے صاحب زادوں حسن کے منہ پر اور حسین کے سینے پر تھپڑ مار کر کہا، عثمان کیسے شہید ہو گئے جب کہ تم ان کی حفاظت کے لیے دروازے پر مقرر تھے۔ انھوں نے پہرے پر متعین زبیر اور طلحہ کے بیٹوں کو بھی سرزنش کی۔ حضرت عثمان کی میت تین دن تک بے گور و کفن رہی، آخر کار مغرب کے بعد چراغ گل کر کے انھیں تدفین کے لیے لے جایا گیا۔ حکیم بن حزام، حویط بن عبدالعزی، ابوجہم بن حذیفہ، نیار بن مُکرَم، جبیر بن مطعم، زید بن ثابت، کعب بن مالک، طلحہ، زبیر، علی اور حسن نے جنازے میں شرکت کی۔

جنگ جمل سے پہلے حسن نے پوری کوشش کی کہ ان کے والد جنگ میں حصہ نہ لیں۔ علی ربذہ آ رہے تھے کہ راستے میں حسن ملے اور کہا، آپ نے میرا کہا نہیں مانا۔ کل کو ناحق مارے جائیں گے اور کوئی مدد نہ کرے گا۔ علی نے کہا، تو ہمیشہ لڑکیوں کی طرح منمناتا رہتا ہے۔ تمھارا کون سا کہا میں نے نہیں مانا؟ حسن نے جواب دیا، حضرت عثمان کا محاصرہ ہونے سے پہلے میں نے کہا تھا کہ آپ مدینہ میں نہ رہیں تاکہ آپ کے ہوتے ہوئے شہادت کا سانحہ نہ ہو۔ ان کی شہادت کے بعد میں نے بیعت لینے سے منع کیا تھا یہاں تک کہ ہر علاقے کا وفد نہ آ جائے۔ پھر جب عائشہ، طلحہ اور زبیر جنگ پر آمادہ ہوئے تو میں نے کہا، آپ جنگ میں حصہ لینے کے بجائے گھر میں بیٹھے رہیں تاکہ آپ کے ہاتھوں کوئی فساد نہ ہو۔ آپ نے ان میں سے کوئی بات نہیں مانی۔ حضرت علی نے ان تینوں باتوں کا مفصل جواب دیا۔ انھوں نے کہا، اگر زمانۂ محاصرہ میں مدینے سے نکل جاتا تو عثمان کی طرح ہمارا بھی گھیراؤ کر لیا جاتا۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ خلافت کا فیصلہ مدینہ والوں ہی نے کرنا تھا، ہم نے اس حق کو ضائع نہیں ہونے دیا۔ تیسری بات، میں جنگ سے بچ کیسے سکتا تھا جب وہ میرے ہی درپے تھے۔ مدینۂ منورہ میں یہ اطلاع پہنچی کہ سیدہ عائشہ کی فوج جس میں طلحہ و زبیر بھی شامل ہیں مکے سے عراق روانہ ہو گئی ہے تو علی نے بھی کوچ کیا۔ ذی قار پہنچ کر انھوں نے عمار اور حسن کو فوج کے لیے نفری اکٹھے کرنے کے لیے کوفہ بھیج دیا۔ وہ کوفہ کی جامع مسجد میں گئے، پہلے عمار نے لوگوں سے خطاب کیا اور حسن ان کے پاس کھڑے رہے۔ پھر حسن کھڑے ہوئے اور کہا، لوگو! اپنے امیر (علی) کی بات مانو اور اپنے بھائیوں کی فوج میں شامل ہو جاؤ۔ ہند بن عمرو نے ان کی دعوت پر لبیک کہا، حجر بن عدی نے تائید کی۔ حسن نے اگلے دن جانے کا اعلان کیا تو نو ہزار (یا ساڑھے نو ہزار) افراد ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بصرہ میں جب فوجیں صف آرا ہوئیں تو حسن میمنہ کے قائد تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے زوردار حملہ کر کے فوج مخالف کو پرے دھکیل دیا۔

۳۷ھ میں جنگ صفین ہوئی تو حضرت حسن نے اس میں بھی شرکت کی۔ حضرت علی قلب میں تھے، ان کے بیٹے حسین اور محمد ان کے ساتھ تھے جب کہ حسن سالار میمنہ تھے۔ جب علی پر دباؤ بڑھا تو وہ میسرہ کی طرف آئے، ان کے بیٹوں نے بھی ان کے ساتھ حرکت کی۔ التوائے جنگ کے لیے عہد نامہ لکھا گیا تو حضرت حسن نے گواہ کے طور پر دست خط کیے۔ اس جنگ کے بعد علی نے حسن کو اپنی املاک کا متولی بھی مقرر کیا۔

رمضان کا مہینہ آتا تو علی ایک رات حسن کے ہاں سے کھانا کھاتے، دوسری شام حسین سے اور تیسری رات ابوجعفر کے گھر سے تناول کرتے۔ وہ تین سے زیادہ لقمے نہ لیتے۔

۴۰ھ میں ابن ملجم نے حضرت علی پر تلوار سے قاتلانہ حملہ کیا۔ زخمی ہونے کے بعد وہ تین دن تک زندہ رہے۔ ان سے حضرت حسن کی جانشینی کے بارے میں پوچھا گیا تو کہا، میں روکتا ہوں نہ حکم دیتا ہوں۔ انھوں نے حسن سے کہا، دیکھو! اگر میں اس ضرب سے مر گیا تو ایک ضرب کے بدلے میں اسے ایک ہی ضرب لگانا، اس کا مثلہ ہرگز نہ کرنا۔ حسن، حسین اور ابوجعفر نے انھیں غسل دیا۔ حسن نے سات تکبیریں پڑھیں، جنازہ بھی انھوں نے پڑھایا۔ علی کی شہادت کے بعد حسن نے لوگوں سے خطاب بھی کیا۔ انھوں نے کہا، تم لوگوں نے علی کو اس رات قتل کیا جس میں قرآن نازل ہوا، اسی رات عیسیٰ علیہ السلام اٹھائے گئے اور اسی میں یوشع بن نون کا قتل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی کو کسی سریے میں بھیجتے تو جبریل ان کے دائیں اور میکائیل بائیں طرف ہوتے۔ ابو ملجم کو حسن کے پاس لایا گیا، اس نے بتایا، میں نے حطیم کے پاس کھڑے ہو کر اللہ سے وعدہ کیا ہے، علی اور معاویہ کو قتل کروں گا۔ مجھے چھوڑ دیں تاکہ اپنی قسم پوری کر لوں۔ حسن نے کہا، نہیں، تو اب جہنم کو جائے گا پھر آگے بڑھ کر اسے قتل کر دیا۔

۴۰ھ میں حضرت علی نے شام جانے کا ارادہ کیا تو ان کی فوج میں شامل چالیس ہزار مسلمانوں نے موت تک ان کا ساتھ دینے کی بیعت کی۔ اسی دوران میں علی شہید ہو گئے تو انھوں نے حسن کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہ سب حضرت علی سے بھی بڑھ کر حسن سے محبت اور ان کی اطاعت کرنا چاہتے تھے۔ سعد بن عبادہ کے بیٹے قیس بن سعد سب سے پہلے بیعت کرنے والوں میں تھے۔ انھوں نے کہا میں قرآن مجید اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے اور مسلمانوں کے خون کو حلال سمجھنے والوں سے جنگ کرنے کی بیعت کرتا ہوں۔ حضرت حسن نے فرمایا، قرآن مجید اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے کی بیعت ہی کافی ہے چنانچہ یہی الفاظ ادا کر کے آپ کی بیعت ہوئی۔ حسن عراق اور اس سے آگے خراسان کے علاقوں میں چار ماہ تک خلیفہ رہے۔ حجاز اور یمن کا ان کی عمل داری میں بتایا جانا درست معلوم نہیں ہوتا۔ کچھ روایات میں ان کی مدت خلافت آٹھ ماہ بتائی گئی ہے، ۲۰ رمضان

۴۰ھ میں حسن کی بیعت ہوئی اور ۱۵ جمادی الاولی میں وہ دست بردار ہو گئے۔ اس طرح کل مدت سات ماہ اور چھبیس دن بنتی ہے۔

پھر حضرت حسن اور حضرت معاویہ نے ایک دوسرے کے خلاف فوج کشی کی۔ دونوں لشکروں کی انبار کے قریب مسکن کے مقام پر مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں بعد میں بغداد کی بنا رکھی گئی۔ حسن کو احساس ہو گیا کہ دونوں لشکر ایک دوسرے کا قلع قمع کیے بغیر ایک دوسرے پر غالب نہ آسکیں گے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت معاویہ سے صلح کرنے کا ارادہ کر لیا اور اس غرض کے لیے عمرو بن سلمہ ارجی کو ان کے پاس بھیجا۔ جواب میں معاویہ نے عبدالرحمان بن سمرہ اور عبداللہ بن عامر کو بھیجا۔ پھر معاویہ اور حسن اکٹھے کوفہ آئے۔ معاویہ نے نخیلہ اور حسن نے قصر میں قیام کیا۔ حسن نے کہا، خلافت آپ کو مل جائے گی لیکن ایک شرط ہے کہ مدینہ، حجاز اور عراق کے لوگوں سے ان کے والد علی کے زمانے میں ہونے والے قضیوں کے بارے میں نہ پوچھا جائے اور انھیں بلا استثنا امان دی جائے۔ معاویہ نے یہ بات مان لی تاہم، دس اشخاص ایسے تھے جنھیں وہ امان نہیں دینا چاہتے تھے۔ انھی میں سے ایک قیس بن سعد تھے جن کے بارے میں معاویہ نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ جب بھی ان کے قابو آئیں گے، ان کی زبان اور ہاتھ کاٹ ڈالیں گے۔ یہ جان کر حسن نے معاویہ کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تب معاویہ نے ایک کورا کاغذ بھیجا اور کہا، اس پر جو شرط بھی لکھیں گے مجھے منظور ہو گی۔ دیگر شرائط یہ تحریر کی گئیں، صوبہ اہواز (دارابجرد) کا خراج کاملاً حسن کو دیا جائے گا۔ حضرت حسین کو سالانہ دو لاکھ درہم الگ دیے جائیں گے۔ صلات و عطیات میں بنو ہاشم کو بنو امیہ پر ترجیح دی جائے گی۔ عمرو بن عاص نے معاویہ سے کہا، حسن کی قوت ختم ہو چکی ہے اس لیے ان کی شرائط نہ مانی جائیں لیکن انھوں نے یہ مشورہ تسلیم نہ کیا۔ کوفہ میں حضرت معاویہ کی بیعت ہو چکی لیکن عمرو بن عاص نے اصرار کیا کہ مجمع عام میں حسن سے دست برداری کا اعلان کرایا جائے۔ معاویہ نے حسن کو لوگوں سے خطاب کرنے کے لیے کہا تو انھوں نے فرمایا، ''اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمارے آبا کے ذریعے تمھیں ہدایت دی اور ان کی اولاد کے وسیلہ سے تمھیں خون ریزی سے بچا لیا۔ سن لو! دانش مند وہ ہے جو پرہیز گار ہے۔ گناہ سب سے بڑی بے بسی ہے۔ جس معاملے میں میرا اور معاویہ کا اختلاف ہوا، اگر میں اس میں حق پر تھا تو میں نے اسے اللہ کی رضا جوئی، امت محمد کی اصلاح کی خاطر اور اہل ایمان کو قتل و غارت سے بچانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔'' اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سچ ثابت ہو گئی کہ حضرت حسن مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کروائیں گے۔ عام خطاب کے علاوہ ایک تقریر وہ بھی ہے جو حسن نے مدائن کے قصر میں کی۔ انھوں نے کہا، تم نے میرے ہاتھ پر ان الفاظ کے ساتھ بیعت کی تھی، میں جس سے

صلح کروں گا، صلح کرو گے اور جس سے جنگ کروں گا تم بھی اس سے جنگ کرو گے۔ میں نے معاویہ کی بیعت کر لی ہے، تم بھی ان کی اطاعت کرو۔

حسن کے ساتھیوں نے صلح کو پسند نہ کیا۔ ان کی فوج کے مقدمہ میں شامل لوگوں کا کہنا ہے، صلح کی خبر سن کر ہمیں اتنا ملال ہوا گویا ہماری کمریں ٹوٹ گئی ہیں۔ کچھ نے کہا، یہ اہل ایمان کے لیے عار ہے۔ سیدنا حسن نے جواب دیا، عار جہنم سے بہتر ہے۔ صلح کے بعد وہ کوفہ آئے تو ایک سردار ابو عامر نے انھوں یوں سلام کیا، السلام علیک ! اے مومنوں کو رسوا کرنے والے۔ انھوں نے جواب دیا، میں نے اہل ایمان کو رسوا نہیں کیا بلکہ اس بات کو پسند نہیں کیا کہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے انھیں قتل کراؤں۔ حسن اس کے بعد مدینہ چلے گئے، وہاں کے لوگوں نے بھی انھیں شرم دلائی۔ انھوں جواب دیا، شرمندہ ہونا جہنم میں گرنے سے بہتر ہے۔ انھوں نے باقی عمر مدینہ ہی میں گزاری، زیادہ وقت عبادت میں صرف کرتے۔ فجر کی نماز پڑھ کر طلوع آفتاب تک مصلے پر رہتے پھر لوگوں سے ملتے جلتے اور چاشت کی نماز ادا کر کے امہات المومنین کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

سیدنا حسن نے معاویہ سے صلح کا ایک سبب یہ بھی بتایا کہ اہل کوفہ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی ہیں جنھوں نے بیعت کرنے کے بعد حسن پر حملہ کیا، انھیں زخمی کر دیا اور ان کے نیچے کی چادر بھی کھینچ لی۔ ساباط کے مقام پر سنان بن جراح اسدی نے کدال کے ذریعے حملہ کیا اور حسن کی ران زخمی کر ڈالی۔ انھوں نے اسے بازووں میں جکڑ کر نیچے گرا دیا۔ پھر عبداللہ بن ظبیان نے اچھل کر حملہ کیا تو حسن نے اس کی ناک کاٹ ڈالی اور سر پھاڑ دیا جس سے وہ موقع ہی پر ہلاک ہو گیا۔ حسن کو چارپائی پر ڈال کر مدائن لے جایا گیا جہاں حضرت علی کے مقرر کردہ گورنر، مختار ثقفی کے چچا سعد نے طبیب بلوا کر ان کا علاج کرایا۔

قیس بن سعد نے مسلمانوں کو امیر کے بغیر لڑائی پر اکسایا۔ لیکن عام مسلمان ان کے پیچھے نہ چلے اور قیس بن سعد مایوس ہو کر الگ ہو گئے۔ بعد میں اسی سال ان کی حضرت معاویہ سے مصالحت ہو گئی۔

صلح ہونے کے بعد وہ شرائط جو حسن نے معاویہ کے مہر بند خط میں تحریر کی تھیں، پوری نہ کی گئیں۔ حضرت علی پر سب و شتم اسی طرح جاری رہا۔ دارابجرد کا خراج بھی حسن کو نہ ملا۔ دوسری روایات کے مطابق اہواز سے ہر سال جمع ہونے والے دس لاکھ درہم حسن کو دس سال تک ملتے رہے۔ اس کے علاوہ صلح کے وقت بیت المال میں موجود ستر لاکھ درہم بھی ان کے حوالہ کیے گئے۔

حضرت معاویہ نے حضرت حسن کی زندگی میں اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت لینے کا ارادہ کیا تھا لیکن ان کی

وفات کے بعد اسے ظاہر کیا۔

ابوعمرو بن علا کہتے ہیں، میں نے حجاج اور حسن سے بڑھ کر کوئی فصیح نہیں دیکھا۔ حسن کی فصاحت حجاج سے بھی زیادہ تھی۔ اس کا اندازہ ان خطبات اور تقریروں سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے مختلف اہم مواقع پر ارشاد کیں۔ یعقوبی نے حسن کے کئی حکیمانہ اقوال نقل کیے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سماع کردہ متعدد احادیث حسن سے روایت کی گئی ہیں، انھوں نے اپنے والد سیدنا علی، بھائی حسین اور ماموں ہند بن ابوہالہ سے بھی حدیث روایت کی ہے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں، ان کے بیٹے حسن، ام المومنین عائشہ ان کے بھتیجے علی بن حسین، ان کے بیٹے عبداللہ اور باقر، عکرمہ، ابن سیرین، جبیر بن نفیر، ابوحورا، ابومجلز، ہبیرہ بن یریم اور سفیان بن لیل۔ سیرت فاروقی کا ایک قابل ذکر حصہ حسن سے مروی ہے۔ حسن فتوے بھی دیتے تھے، ان میں سے چند نقل کیے گئے ہیں۔

حضرت حسن سے روایت کردہ چند احادیث: حسن روایت کرتے ہیں، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کلمات سکھائے جو میں وتر میں رکوع سے سر اٹھانے کے بعد سجدہ میں جانے سے پہلے پڑھتا ہوں۔ ''اللّٰھم اھدنی فیمن ھدیت و عافنی فیمن عافیت و تولنی فیمن تولیت و بارك لی فیما اعطیت و قنی شر ما قضیت فانك تقضی و لا یقضی علیك و انه لا یذل من والیت تبارکت ربنا و تعالیت۔ اے اللہ! مجھے ہدایت دے، ان لوگوں میں شامل کرتے ہوئے جنھیں تو نے ہدایت دے رکھی ہے۔ مجھے عافیت بخش، ان لوگوں کے زمرہ میں شامل کرتے ہوئے جنھیں تو نے عافیت دے رکھی ہے۔ مجھے دوست بنا لے، ان لوگوں سے ملاتے ہوئے جنہیں تو نے دوست بنالیا ہے۔ اپنے دیے ہوئے رزق میں میرے لیے برکت ڈال دے۔ اس شر سے مجھے بچا جس کا تو نے فیصلہ کرلیا ہے، کیونکہ تو ہی فیصلہ کرتا ہے اور تیرے علی الرغم کوئی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ جس کی تو مدد کرتا ہے، رسوا نہیں ہوتا۔ میرے رب! تو بہت برکت والا اور بہت بلند ہے۔'' حسن سے پوچھا گیا، آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات یاد ہے؟ تو انھوں نے بتایا، میں نے صدقے کی ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی تھی تو آپ نے اسے لعاب سمیت میرے منہ سے نکال لیا تھا۔

حضرت حسن کو کئی بار زہر دیا گیا لیکن بچ جاتے۔ آخری بار زہر دیا گیا تو طبیب نے کہا، اس زہر نے آپ کی انتڑیوں کو کاٹ ڈالا ہے۔ حضرت حسین ان سے ملنے آئے تو کہا، مجھے تین بار زہر دیا گیا ہے لیکن اس دفعہ تو اس نے میرا جگر چھلنی کر ڈالا ہے۔ انھوں نے پوچھا، بھائی جان! آپ کو کس نے زہر دیا ہے؟ کہا، تمھارا پوچھنے کا کیا مقصد

ہے؟ کیا تو اس سے لڑنا چاہتا ہے؟ میں نے ان لوگوں کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ کہا جاتا ہے، انھیں ان کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے معاویہ کے کہنے پر زہر دیا۔ اہل تاریخ نے اس روایت کو قبول نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ معاویہ کو زہر خورانی کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ حسن کو خلافت سے دست بردار ہوئے دس سال بیت چکے تھے، اس دوران میں ان کی طرف سے ایسی کوئی بات نہ ہوئی تھی جس سے معاویہ کو خطرہ محسوس ہوتا۔ البتہ یہ امکان ہے کہ جعدہ نے سوتاپے کی بنا پر زہر دیا ہو۔ ایک اور روایت ہے کہ حسن کی وفات زہر کے بجائے علالت سے ہوئی۔

جب حسن کی وفات کا وقت آیا تو انھوں نے کہا، مجھے کھلے صحن میں لے جاؤ، میں آسمان کا نظارہ کرنا چاہتا ہوں۔ انھیں صحن میں لایا گیا تو آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا، اے اللہ! میں تیرے پاس رہنے کو ترجیح دوں گا۔ اسی حال میں ان کی جان نکلی۔ سن وفات ۴۹ھ (دوسری روایت: ربیع الاول ۵۰ھ) ہے۔ ان کی عمر چھیالیس یا سینتالیس برس ہوئی۔ سیدنا حسن نے حضرت حسین کو وصیت کی کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دفن کیا جائے۔ اپنے مرض الموت میں حسن نے سیدہ عائشہ سے اس کی اجازت بھی لے لی تھی لیکن مروان نے ایسا نہ کرنے دیا۔ حسین بہت برافروختہ ہوئے لیکن ابوہریرہ نے انھیں تلقین کی کہ اس بات پر جھگڑا نہ کیا جائے۔ آخر کار جنت البقیع میں ان کی تدفین ہوئی، نماز جنازہ گورنر مدینہ سعید بن عاص نے پڑھائی۔ حضرت حسین نے یہ کہہ کر انھیں آگے کیا، اگر ایسا کرنا سنت نہ ہوتا تو میں آپ کو کبھی نہ کہتا۔ وہ بنوامیہ کے اکیلے فرد تھے جنھوں نے جنازہ میں شرکت کی۔ نماز کے بعد خالد بن ولید بھی تدفین میں شامل ہوئے۔ مسعودی کے زمانہ میں حضرت حسن کے مقبرہ پر کوئی تعمیر تھی جس کے پتھر کی تحریر ’’التنبیہ والاشراف‘‘ میں درج کی گئی ہے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے، دروازۂ بقیع کے دائیں طرف ایک مضبوط خوب صورت گنبد ہے۔ اس گنبد سے آگے عباس بن عبدالمطلب کی قبر ہے اور اس کے بعد حضرت حسن کی۔ ۱۳۴۴ء میں یہ عمارتیں گرادی گئیں۔

حضرت حسن کی ازواج میں سے ام بشیر بنت ابو مسعود انصاری اور خولہ کے نام معلوم ہیں۔ جعدہ بنت اشعث کا نام زہر خورانی کے ضمن میں آیا ہے۔ بنوفزارہ اور بنو اسد سے تعلق رکھنے والی دو اور بیویوں کا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ ان کے نام نہیں بتائے گئے۔ ان کے بیٹوں کے نام یہ ہیں: حسن، زید، عمر، قاسم، ابوبکر، عبدالرحمان، طلحہ اور عبید اللہ۔

حضرت حسن بالوں کو وسمہ لگاتے تھے۔ حسن بہت حلیم الطبع اور انتہائی پرہیز گار تھے۔ وہ کسی کی ناحق جان نہ لینا چاہتے تھے، اسی وجہ سے خلافت سے کنارہ کشی کر لی۔ فرماتے ہیں، جب سے میں سن شعور کو پہنچا ہوں اور اپنے نفع و نقصان کا علم ہوا ہے، یہ بات جان چکا ہوں کہ مجھے امت محمد کا اقتدار وانصرام خون بہائے بغیر نہیں مل سکتا اور میں یہ

ہرگز نہیں چاہتا۔ حضرت حسن غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرتے تھے۔ ایک آدمی ان کے پاس بیٹھا دعا مانگ رہا تھا۔ اے اللہ مجھے دس ہزار دینار دے دے۔ وہ گھر گئے اور اتنی رقم اسے بھجوا دی۔ انھوں نے تین مرتبہ کل مال کا نصف اللہ کی راہ میں دے دیا۔ ایسا بھی ہوا کہ کل دو جوڑے جوتے پاس تھے، ایک رکھا اور دوسرا خیرات کر دیا۔ ایک دفعہ وہ معتکف تھے کہ ایک سوالی آیا، انھوں نے حالت اعتکاف سے نکل کر اس کی ضرورت پوری کی اور واپس چلے گئے۔ ایک بار دوران طواف میں کسی نے اپنی ضرورت کے لیے لے جانا چاہا تو وہ طواف چھوڑ کر اس کے ساتھ چل دیے اور باقی طواف واپس آ کر پورا کیا۔ اللہ ان سے راضی ہو اور ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے، آمین۔

مطالعۂ مزید: الجامع المسند الصحیح (بخاری، شرکۃ دار الارقم)، المسند الصحیح المختصر من السنن (مسلم، شرکۃ دار الارقم) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، الاصابہ فی تمییز الصحابہ (ابن حجر)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ جات: غلام رسول مہر، مرتضیٰ حسین فاضل)

محمد عمار خان ناصر

ڈاکٹر اسرار احمد کے ناقدانہ طرز فکر کا ایک مطالعہ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

بیسویں صدی میں مسلم قومی ریاستوں کے ظہور نے حیات اجتماعی کے دائرے میں مسلمان معاشروں کی تشکیل نو اور بالخصوص مذہب کے کردار کو اہل دانش کے ہاں غور وفکر اور بحث ومباحثہ کا ایک زندہ موضوع بنا دیا۔ اسلام چونکہ محض پوجا اور پرستش کا مذہب نہیں، بلکہ انسانی زندگی میں مخصوص اعتقادی واخلاقی اقدار اور متعین احکام وقوانین کی عمل داری کو بھی اپنا مقصد قرار دیتا ہے، اس لیے مذہب کے اجتماعی کردار کا سوال اپنے متنوع پہلووں کے ساتھ ان مفکرین کے غور وفکر اور مطالعہ وتحقیق کا موضوع بنا جو جدید تہذیبی رجحانات کے علی الرغم ریاست اور مذہب کے باہمی تعلق کو نہ صرف مضبوط دیکھنا چاہتے تھے، بلکہ ریاست کو خالص مذہبی ونظریاتی اساسات پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ اس نوع کے اہل فکر کی جدوجہد اور خدمات کو درست تناظر میں دیکھنے کے لیے یہ نکتہ سامنے رہنا چاہیے کہ یہ سب حضرات بنیادی طور پر امت مسلمہ کے زوال کو موضوع بناتے ہیں جو مغرب کے تہذیبی اور سیاسی استیلا کے نتیجے میں عالم اسلام پر مسلط ہوا ہے اور جس نے بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے انداز فکر، ترجیحات اور طرز زندگی کو ان خطوط سے بالکل مختلف خطوط پر استوار کر دیا ہے جس کی تعلیم ان کے دین نے دی ہے۔ کسی اجنبی تہذیب کے سامنے فکر واعتقاد اور تہذیب ومعاشرت کی سطح پر سر تسلیم خم کر دینا چونکہ خود داخلی سطح پر ایمان واعتقاد کی کمزوری اور فکری وعملی ترجیحات کی کجی کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے ان تمام اہل فکر کی توجہ فطری طور پر خود امت مسلمہ کے فکر وعمل کی اصلاح کی طرف مبذول ہوئی۔ اگرچہ ان سب کی فکری کاوشوں میں مغربی فکر وتہذیب کا حوالہ مسلسل پایا جاتا ہے اور اس کی فکری و

نظریاتی اساسات کے تجزیہ وتنقید پر بھی انھوں نے بھرپور فکری توانائیاں صرف کی ہیں، تاہم، اس ساری گفتگو کا مخاطب اصلاً مغربی ذہن نہیں، بلکہ مغربی اندازنظر کے اثرات کو قبول کرنے والے مسلمان ہی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا درست دکھائی دیتا ہے کہ ماضی قریب اور حال کی تمام احیائی تحریکیں، اپنے اندازنظر اور حکمت عملی کے تمام تر تنوع کے باوجود، امت مسلمہ کی عظمت رفتہ کی بازیابی کی کلید خود مسلمانوں کے فکرونظر میں تبدیلی کو قرار دیتی ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا شمار ہمارے دور کے ان نامور اہل فکر میں ہوتا ہے جنھوں نے امت مسلمہ کو درپیش صورت حال، اس کے اسباب وعوامل اور اصلاح احوال کی حکمت عملی پر پوری آزادی، گہرائی اور originlaity کے ساتھ غوروفکر کیا اور ان کے غوروفکر نے جن نتائج تک انھیں پہنچایا، انھوں نے قدیم یا جدید اور روایتی یا غیرروایتی طبقات کی پسند یا ناپسند کا لحاظ کیے بغیر بلاخوف لومۃ لائم پوری جرات کے ساتھ ان کا اظہار بھی کیا۔ ان کے نتائج فکر سے یقیناً اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اپنی حریت فکر اور آزادانہ اندازنظر کے لحاظ سے وہ بلاشبہ اقبال کے اس مصرعے کا مصداق تھے کہ: 'نہ ابلہ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند'۔ چنانچہ جہاں انھوں نے تہذیب مغرب کی فکری ونفسیاتی اساسات اور اس کے تباہ کن نتائج اور خاص طور پر مسلمان معاشروں میں اس تہذیب کے فکری وعملی اثرات کے سامنے سرتسلیم خم کرنے والے طبقات کو اپنے ناقدانہ تجزیوں کا موضوع بنایا، وہاں خود ان طبقات کے اندازفکر کی تنقید میں بھی انھوں نے کوئی رعایت نہیں برتی جو مغرب زدہ طبقے کے بالمقابل اسلام اور امت مسلمہ کی سربلندی کا جذبہ اور مسلمانوں کے قومی مفاد سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ ایک صاحب فکر خود جس حلقۂ فکر سے تعلق رکھتا ہو اور بحیثیت مجموعی اس طبقے کے احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتا ہو، اس کے لیے خودتنقیدی کا یہ عمل بہت مشکل ہوتا ہے، چنانچہ سطحی سیاست کاروں کے برعکس جو عوامی جذبات واحساسات کو محض سیاسی کھیل تماشے کے لیے استعمال کرنا جانتے ہیں، خودتنقیدی کی یہ ذمہ داری سنجیدہ، دیانت دار اور حقیقی طور پر امت کے خیر خواہ اہل دانش ہی انجام دے سکتے ہیں۔ میرے نزدیک اس نوع کے اصحاب فکر کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن جس کا تسلسل ان کے حلقۂ فکر اور متوسلین کو ہر حال میں قائم رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے، یہی ہے، کیونکہ ان کے اندازفکر کے اس حرکی پہلو کو نظرانداز کر کے اگر مخصوص نتائج فکر تک اپنے آپ کو محدود کر لیا جائے تو اسی سے وہ تقلیدی جمود وجود میں آتا ہے جس سے خود یہ اصحاب فکر زندگی بھر نبرد آزما رہے۔

اس تناظر میں، آج کی اس نشست میں، میں نے گفتگو کے لیے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رحمہ اللہ کے فکرونظر کے متنوع اور گوناگوں پہلوؤں میں سے اسی خاص پہلو کو منتخب کیا ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کی مختلف تحریروں اور خطابات

سے جمع کیے گئے کچھ منتخب اقتباسات پیش کروں گا جن میں مذہبی یا نیم مذہبی اندازفکر کے چند مخصوص پہلووں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان اقتباسات کا انتخاب اتفاق رائے یا تائید کے اصول پر نہیں کیا گیا، بلکہ اصل مقصد ڈاکٹر صاحب کے ناقدانہ زاویہ نظر کو واضح کرنا ہے جو میرے نزدیک اختلاف کی گنجائش کے باوجود فی نفسہ ایک نہایت قابل قدر اور قابل تقلید چیز ہے۔ یہ کام مختصر وقت میں بالکل سرسری انداز میں ہی کیا جا سکا ہے، تاہم، امید ہے کہ پیش نظر نکتے کو واضح کرنے کے لیے کسی حد تک مفید ہو گا۔

اسلام میں عدل اجتماعی کا تصور اور روایتی فقہی انداز نظر

نفاذ اسلام کے ضمن میں قائداعظم و علامہ اقبال کے تصورات کے بالمقابل مذہبی طبقات کے تصور اسلام کی محدودیت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے:

''موسسین پاکستان اقبال اور جناح کے افکار میں تو زیادہ زور اسلام کے نظام اجتماعی پر تھا، یعنی اسلام کا سیاسی، اقتصادی اور سماجی نظام (System of Social Justice as given by Quran) لیکن تحریک پاکستان کی، علما و مشائخ نے جو حمایت کی تھی، ان کے پیش نظر یہ تھا کہ اس خطے میں اسلامی قوانین اور اسلامی شریعت نافذ کی جائے۔..... یہ دونوں پہلو سامنے رکھیے جو ایک دوسرے سے قدرے مختلف، لیکن درحقیقت لازم و ملزوم ہیں۔ قائد اعظم اور علامہ اقبال دونوں کے نزدیک اسلام کا نظام اجتماعی تھا جو انسان کو عدل دیتا ہے، جبکہ علما و مشائخ کے نزدیک اسلامی قوانین و شریعت خصوصاً حدود و تعزیرات کا نفاذ تھا جو اس نظام کو سہارا دیتے ہیں۔''

(پاکستان کے وجود کو لاحق خطرات و خدشات، ص ۱۸)

ڈاکٹر صاحب نے روایتی فقہی ذخیرے کے بعض مخصوص تصورات کو بھی اسی تناظر میں نقد و جرح کا موضوع بنایا ہے۔ مثال کے طور پر مزارعت کو جائز قرار دیے جانے سے اسلام کے معاشی مقاصد پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جیسے جیسے ملوکیت اور جاگیرداری کی جڑیں زمین میں گہری اترتی گئیں، حالات کے جبر اور ''نظریہ ضرورت'' کے عمل دخل کا ظہور ہوا اور امام ابوحنیفہ کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسف نے ..... امام صاحب کے دوسرے شاگرد امام محمد کے اتفاق رائے کے ساتھ مزارعت پر کچھ شرائط عائد کر کے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ بھی دے دیا۔ بعد میں وہ شرائط تو طاق نسیاں کے حوالے ہو گئیں اور پورے عالم اسلام میں ''مزارعت'' شیر مادر کی مانند حلال وطیب

ہوگئی اوراس طرح شہنشاہیت اور جا گیرداری کودوام واستحکام حاصل ہوگیا۔‘‘

(اسلام میں عدل اجتماعی کی اہمیت، ص۴۲، ۴۳)

’’سوڈیڑھ سو برس بعد جبکہ ملوکیت بھی اپنی پوری شان اور کروفر کے ساتھ جلوہ گر ہو چکی تھی اور ’’قرون مشہود لہا بالخیر‘‘ (یعنی وہ ادوار جن کے خیر کے حامل ہونے کی گواہی خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے) کا زمانہ بھی بیت چکا تھا، علماے اسلام اور فقہاے کرام کا حالات کے جبر سے متاثر ہو جانا ہرگز نہ بعید از قیاس ہے نہ ان کے لیے موجب توہین۔‘‘ (اسلام میں عدل اجتماعی کی اہمیت، ص ۴۶)

فقہ اسلامی کی تشکیل میں اس دور کے جو مخصوص تمدنی حالات اور ضروریات کارفرما رہی ہیں، اس کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب نے فقہاے اسلام کے اخذ کردہ مخصوص نتائج فکر کی پابندی کے بجائے قرآن وسنت سے براہ راست اخذ واستنباط کی ضرورت واہمیت کو بھی بڑی تاکید سے واضح کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

’’ایسے اصحاب علم ودانش آگے بڑھیں جو کتاب وسنت کے نصوص کی پابندی کے عزم مصمم کے ساتھ ساتھ صرف سلف کی اجتہادی آرا کے مقلد جامد بن کر نہ رہ جائیں، بلکہ شریعت کے اصل مقاصد واہداف کو بھی پیش نظر رکھ سکیں اور جہد وجہاد کے جذبے سے سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ قیاس واجتہاد اوراس کے ضمن میں مصالح مرسلہ اور مفاد عامہ کو بھی ملحوظ رکھ سکیں۔‘‘ (اسلام میں عدل اجتماعی کی اہمیت، ص ۲۹)

’’ایک مجلس کی تین یا تین سے بھی زائد طلاقوں کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو ایک رعایت اور نرمی فرمایا کرتے تھے، اسے حضرت عمر نے مصلحت امت کے پیش نظر اپنے ایک اجتہادی فیصلہ سے ختم کر دیا تو اس پر تو اہل سنت کے چاروں مکاتب فقہ کا اس درجہ عزم بالجزم کے ساتھ اصرار ہے کہ کسی بھی صورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رعایت کو دوبارہ جاری کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔‘‘ (اسلام میں عدل اجتماعی کی اہمیت، ص ۴۵)

احیائی تحریکوں کی یک رخی فکری ترجیحات

بیسویں صدی کی مسلم احیائی تحریکوں کے ہاں اسلام کو بطور ایک اجتماعی نظام کے نمایاں کرنے کی کوشش اس انداز سے ہوئی ہے کہ دین کا روحانی اور باطنی پہلو مقدم الذکر پہلو کا خادم اور تابع قرار پا کر بڑی حد تک دب گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پہلو کی بجا طور پر نشان دہی کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

’’ذرا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعہ اسلام اسی مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادے اور حیات اخروی پر حیات دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعاتی

اعتقادات کا اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے، لیکن انھیں کچھ زیادہ درخور اعتنا اور لائق التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیۃً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز ہیں جو حیات دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام 'اسلامی نظام زندگی' رکھا گیا ہے۔..... اسی نقطۂ نظر کا کرشمہ ہے کہ دین اسٹیٹ (State) کا ہم معنی قرار پایا ہے اور عبادت، اطاعت کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ نماز کا یہ مقام کہ وہ معراج المومنین ہے، نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور نفس انسانی کا اس سے ایسا انس کہ 'قرۃ عینی فی الصلوۃ' کی کیفیت پیدا ہو سکے، ناپید ہے۔..... زکوٰۃ کا یہ پہلو کہ یہ روح کی بالیدگی اور تزکیے کا ذریعہ ہے، اس قدر معروف نہیں جتنی اس کی یہ حیثیت کہ یہ اسلامی نظام معیشت کا اہم ستون ہے۔ روزہ کے بارے میں یہ تو خوب بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ضبط نفس (Self control) کی مشق و ریاضت ہے، لیکن اس کی اس حقیقت کا یا تو سرے سے ادراک ہی نہیں ہے یا اس کے بیان میں 'حجاب' محسوس ہوتا ہے کہ یہ روح کی تقویت کا سامان اور جسد حیوانی کی اس پر گرفت کو کمزور کرنے کا ذریعہ ہے۔.... اسی طرح حج کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ اس کے ذریعے ''خدا پرستی کے محور پر ایک عالمگیر برادری'' کی تنظیم ہوتی ہے، لیکن اس سے آگے اس کی روحانی برکات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا!..... کہنے میں تو اگرچہ یہ آیا کہ اسلام فلاح انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاح اخروی اور فلاح دنیوی دونوں شامل ہیں، لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیات دنیوی پر مرکوز ہیں، لہٰذا آخری تجزیے میں اسلام ایک ''سیاسی و عمرانی نظام'' (Politico-Social System) بن کر رہ گیا۔..... اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع 'مذہبی' سے زیادہ 'سیاسی و عمرانی' اور 'دینی' سے زیادہ 'دنیوی' ہیں اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشرتی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ ان کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریت یا اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور ان کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے۔.... یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ ہی یہ یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا۔''

(نشاۃ ثانیہ ص ۱۱ تا ۱۷)

ڈاکٹر صاحب نے غلبہ دین کا مقصد حاصل کرنے کے لیے ان احیائی تحریکوں کی عجلت پسندانہ حکمت عملی پر بھی تنقید کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی عیسوی کی یہ اسلامی تحریکیں جو انڈونیشیا سے مصر تک متعدد مسلمان ممالک میں تقریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں اور یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ تقریباً

ایک ہی تصور دین ان کی پشت پر کام کر رہا ہے اور ایک ہی جذبہ ان میں سرایت کیے ہوئے ہے۔..... یہ تحریکیں تقریباً ثلث صدی سے مختلف مسلمان ملکوں میں برسرعمل ہیں اور ملت اسلامی کی نوجوان نسل کا ایک خاصا قابل ذکر حصہ ان کے زیر اثر آیا ہے، لیکن عملاً ان میں سے کسی کو کوئی نمایاں کامیابی کہیں حاصل نہیں ہو سکی، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں اپنا وقت پورا کر چکی ہیں اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب کی تعبیر کا وقت ابھی نہیں آیا۔ چنانچہ مصر میں اخوان المسلمون کا اندرون ملک تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے اور اس کے باقیات الصالحات جلاوطنی کے عالم میں دوال عرب کی باہمی آویزش کے سہارے جی رہے ہیں۔ رہی برصغیر کی تحریک اسلامی تو اس کا جزو اعظم پاکستانی سیاست کے نذر ہو چکا ہے اور اب اس کا مقام تحریک جمہوریت کی حاشیہ برداری سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔

ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انھوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی معتد بہ تعداد کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور 'ترقی پسند' عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آ گئی، لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہ راست نتیجہ ہے ان کے تصور دین کی خامی اور مطالعہ اسلام کے نقص کا۔'' (نشاۃ ثانیہ ص ۱۱ تا ۱۷)

ہندو مسلم منافرت کی تاریخی بنیادیں

برصغیر میں ہندو مسلم منافرت کا جو مسئلہ اس وقت اس پورے خطے کے امن واستحکام کے لیے ایک بہت بڑے چیلنج کی صورت اختیار کر چکا ہے، تاریخی بنیادوں پر اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے یک طرفہ طور پر ہندوؤں کو موردالزام ٹھہرانے کے بجائے خود مسلمانوں کو بھی اپنے گریبان میں جھانکنے کی دعوت دی ہے، چنانچہ مسلمان بادشاہوں کے طرز حکومت کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''بدقسمتی سے ہمارے ملک کے بعض دانش وروں نے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نفرت کے ''چلتے ہوئے جھکڑ'' اور بداعتمادی کی ''اٹھتی ہوئی آندھی'' کے ایک سبب کو اس درجہ اچھالا ہے اور اس شدت کے ساتھ تحریر و تقریر کا موضوع بنایا ہے کہ دوسرے جملہ عوامل نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ عوام کے اذہان میں اس پوری صورت حال کے واحد سبب کی حیثیت صرف ہندوؤں کی عمومی چھوت چھات، برہمنوں کے سامراجی مزاج اور بنیوں کی چاپلوسانہ عیاری کی ذہنیت کو حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ ایک جانب یہ پہاڑ جیسی عظیم حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی کہ ہندو معاشرہ صرف برہمنوں اور بنیوں ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں راجپوت اور شودر بھی موجود ہیں جو اپنا اپنا جداگانہ مزاج رکھتے ہیں۔ مزید برآں خود برہمنوں اور بنیوں میں بھی ''نہ ہر زن

زن است و نہ ہر مرد مرد -- خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد' کے مصداق ہر مزاج اور کردار کے لوگ موجود ہیں اور دوسری جانب ان دو اہم عوامل سے تو کامل ذہول ہو گیا جن میں سے ایک کا تعلق ماضی بعید اور خود مسلمانوں کے اپنے کردار سے ہے اور دوسرے کا ماضی قریب اور انگریزوں کے کردار سے!

ان میں سے مقدم الذکر سے صرف نظر اور غض بصر کا معاملہ تو

''وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا''

کے عین مطابق ہے، اس لیے کہ اس تلخ حقیقت کا اعتراف بہت مشکل ہے کہ خود ہم مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی ''ہزار سالہ'' حکومت کے دوران اکثر و بیشتر وہی ''اقوام غالب'' والا کردار اختیار کیا تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اور نہ صرف یہ کہ اپنے ان فرائض کو توسرے سے ادا ہی نہیں کیا تھا جو امت مسلمہ اور امت محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہونے کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتے تھے، یعنی اللہ کے پیغام کی دعوت و تبلیغ اور اسلام کے عادلانہ نظام زندگی اور دین حق کے نظام عدل وقسط کے قیام کے ذریعے خلق خدا پر اللہ کی رحمانیت و رحیمیت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کا عملی مظاہرہ اور اس طرح اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہندوستان میں بسنے والوں پر اتمام حجت، بلکہ بہت سے حکمرانوں نے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ قائم رکھنے کے علاوہ ذاتی عیاشی اور بوالہوسی کے وہ جملہ انداز اختیار کیے جو ہمیشہ سے ملوکیت اور بادشاہی کے لوازم میں سے رہے ہیں اور ان سب کی بنا پر ہندوؤں میں عمومی طور پر وہ انتقامی جذبہ موجود تھا جو سقوط ڈھاکہ کے حادثہ فاجعہ کے موقع پر ع ''نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں'' کے مطابق فتح مندی کی سرمستی میں پنڈت موتی لال نہرو جیسے وسیع المشرب انسان کی پوتی اور جواہر لال نہرو جیسے سیکولر اور سوشلسٹ مزاج کے حامل شخص کی بیٹی مسز اندرا گاندھی کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ سے ظاہر ہو گیا کہ ''ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا لیا ہے!''

(پاک بھارت تعلقات، ص ۱۲، ۱۴۳)

پاکستان اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کی آئیڈیل صورت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے دونوں سب سے بڑے علم برداروں، یعنی مصور و مفکر پاکستان علامہ اقبال اور معمار و موسس پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے تقسیم کے بعد کے حالات کے ضمن میں جو خواب دیکھے تھے، وہ اس صورت حال کے بالکل برعکس تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں قائداعظم نے تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کی تھی کہ ''بھارت اور پاکستان کے تعلقات ایسے ہی ہوں گے جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے مابین ہیں''، لیکن علامہ

اقبال نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے خطبہ الٰہ آباد (دسمبر ۱۹۳۰ء) میں یہاں تک فرمادیا تھا کہ ''ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع مسلم ریاست ہر نوع کی جارحیت کے مقابلے میں ہندوستان کے دفاع کا فریضہ بہترین طور پر سرانجام دے گی، خواہ وہ جارحیت نظریات کی ہو خواہ ہتھیاروں کی۔'' (پاک بھارت تعلقات، ص ۲۸)

پاک بھارت تعلقات اور مسئلہ کشمیر

ڈاکٹر صاحب نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے اختیار کی جانے والی حکمت عملی پر بھی تنقید کی اور ہمارے ہاں پائے جانے والے غالب لیکن جذباتی طرز فکر کے برعکس مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے جنگ کے راستہ کو عملاً غیر موثر اور غیر نتیجہ خیز قرار دیا۔ فرماتے ہیں:

''سب سے پہلے جنگ کو لیجیے جس کی آج کل بار بار دہائی دی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ فی الواقع اور خصوصاً بحالات موجودہ کوئی قابل عمل حل ہے؟ کیا ہم جنگی صلاحیت کے اعتبار سے بھارت کے مقابلے میں آج کی نسبت ۱۹۶۵ء میں کہیں زیادہ بہتر حالت میں نہیں تھے؟ پھر اگر اس وقت کامیابی حاصل نہیں ہوسکی تھی تو آج اس کی کتنی امید کی جاسکتی ہے؟

مسلمانان کشمیر پر بھارت کی ننگی جارحیت اور بے پناہ ظلم و بربریت کے خلاف پاکستان کی جانب سے کھلم کھلا اعلان جنگ صرف اس صورت میں ہوسکتا تھا کہ ہمیں اپنے موقف کے مبنی برحق وانصاف ہونے کے ساتھ ساتھ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۰ کے ان الفاظ مبارکہ کے مطابق کہ: ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم یعنی ''اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا!'' اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کا یقین بھی حاصل ہوتا، جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سودی معیشت کے نظام کو جاری رکھنے کے باعث خود ہی اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ برسر جنگ ہیں، لہٰذا فرمان نبوی 'فانی یستجاب لذالك' یعنی ''ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہوسکتی ہے؟'' کے مطابق ہمیں اللہ کی نصرت و تائید کی امید کیسے ہوسکتی ہے! بنا بریں لے دے کر سارا معاملہ صرف مادی اسباب و وسائل کی کمیت اور کیفیت کا رہ جاتا ہے جس کا تقابلی جائزہ اور موازنہ آئے دن اخبارات کی زینت بنتا رہتا ہے۔''

''رہا مسلمانان کشمیر کا سرفروشانہ اور بے مثال جہاد حریت تو اس کے ضمن میں بھی جذبات سے ہٹ کر عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ کسی کھلم کھلا اور ٹھوس بیرونی امداد کے بغیر آخر وہ اسے حکومت پاکستان کی صرف اخلاقی اور سفارتی مدد اور بعض نجی اداروں کی جانب سے چوری چھپے اور وہ بھی اونٹ کے منہ میں زیرہ کے بقدر، امداد کے بل پر کب تک جاری رکھ سکیں گے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی بہت سے حلقوں، بالخصوص مذہبی گروہوں کی جانب سے عوام کو بہت بڑے بڑے مغالطے دیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اولاً جہاد افغانستان کا حوالہ دیا جاتا ہے، حالانکہ ہر

شخص جانتا ہے کہ اس معاملے میں ایک سپر پاور کی کھلم کھلا، اعلانیہ اور فیصلہ کن مالی اور جنگی مدد حاصل تھی (جس کی بہتی گنگا میں خود پاکستان کے بہت سے مقتدر افراد اور مذہبی جماعتوں نے خوب خوب ہاتھ دھوئے) لہٰذا کشمیر کے معاملے میں افغانستان کا حوالہ قیاس مع الفارق کی حیثیت رکھتا ہے۔''

(پاک بھارت تعلقات، ص ۳۶، ۳۷، ۳۸)

جنرل ضیاء الحق صاحب کے دور میں کشمیر میں خفیہ دراندازی کی جو پالیسی شروع کی گئی اور جسے بعد میں حالات کے جبر کے تحت بڑی حد تک ترک کر دینا پڑا، اس کے نتائج و مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے:

''جس جہاد کو ہم چودہ سال سے سپانسر کر رہے تھے اور اسے جہاد فی سبیل اللہ قرار دے رہے تھے، اس سے بھی ہم نے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس کا ردعمل کشمیریوں میں یہ ہوا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان نے ہم سے دھوکہ کیا ہے، اس نے ہم کو مروایا ہے۔ میں جہاد کے نام پر کشمیر میں خفیہ مداخلت کا ہمیشہ سے مخالف تھا۔ اب میں بڑی تلخ بات کہہ رہا ہوں کہ پاکستان نے کشمیریوں سے ۱۹۶۵ء کا بدلہ لیا ہے۔ پاکستان نے ۱۹۶۵ء میں اپنے بہترین کمانڈوز کو اس توقع پر کشمیر میں داخل کر دیا تھا کہ کشمیری مسلمان مدد کریں گے، لیکن کشمیریوں نے کوئی حمایت نہیں کی اور وہ تقریباً سارے کے سارے شہید ہو گئے۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ بھارت پلٹ کر لاہور پر حملہ آور ہو گیا اور ہماری ساری کوشش ناکام ہو گئی۔ کشمیریوں کے جہاد حریت میں اگرچہ پاکستان سے بھی بہت سوں نے وہاں جا کر جانیں دی ہیں، لیکن مصائب کا اصل پہاڑ تو کشمیریوں پر ٹوٹتا رہا ہے۔ عصمت دری تو ان کی عورتوں اور بیٹیوں کی ہوئی ہے، انھی کے گھروں کو مسمار کیا گیا ہے، انھی کی آبادیاں تھیں جو تھوک کے حساب سے جلا دی گئیں اور انھی کی دکانیں ختم ہوئی ہیں۔ میرے نزدیک پاکستان نے کشمیریوں سے گویا ۱۹۶۵ء کا بدلہ لیا ہے، جبکہ انھوں نے پاکستان کی حمایت نہیں کی تھی۔'' (پاکستان کے وجود کو لاحق خطرات و خدشات، ص ۳۳)

جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح کا غلط استعمال

عالم اسلام کے طول و عرض میں مغرب اور مغرب زدہ حکمران طبقات کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے 'جہاد' کی اصطلاح اپنی اثر انگیزی اور عملی افادیت کی وجہ سے بڑے پیمانے پر استعمال کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے بھی اختلاف کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''ایک دوسری چیز جس نے میرے نزدیک جلتی پر تیل کا کام کیا ہے اور پھر اس کی وجہ سے اصل بدنامی مسلمانوں

کے حصے میں آئی ہے، یہ مغالطہ ہے کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے، وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس غلط فہمی کے بدترین نتائج نکلے اوراس نے جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح کو بری طرح بدنام کیا۔ ظاہر بات ہے کہ ہمارے دور ملوکیت میں بادشاہ جوجنگیں کرتے تھے، ان کا محرک ان کی ہوس ملک گیری ہوتی تھی تا کہ بڑے سے بڑے محل بنا سکیں اورزیادہ سے زیادہ محصولات (Revenues) اکٹھے ہوسکیں، لیکن ان جنگوں کوبھی جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا۔ ظاہر ہےاس کے نتیجے میں اس مقدس اصطلاح کوتو بدنام ہونا ہی تھا۔

اس ضمن میں تازہ ترین مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ اسی (بیسویں) صدی کے وسط یعنی پچاس کی دہائی میں الجزائر میں فرانس سے آزادی کی جنگ لڑی جارہی تھی۔ حصول آزادی کے لیے مسلمانوں کی جنگ ایک جائز جنگ ہے، مگر آزادی کی ہر جنگ جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے، لیکن الجزائر کی اس جنگ آزادی کو جہاد فی سبیل اللہ کا نام دے دیا گیا۔..... اس ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا نتیجہ کیا نکلا؟ جب وہ جہاد کامیاب ہوگیا تو وہاں ایک سوشلسٹ ریاست وجود میں آ گئی۔ عجیب بات ہے کہ جو درخت آم کا تھا، اس پر برگ وبار کسی اور شے کے آ گئے۔ درحقیقت وہ جنگ آزادی تھی، جہاد حریت تھا، جہاد فی سبیل اللہ نہیں تھا۔ چنانچہ کامیابی کی صورت میں وہاں کے ایلیٹ طبقہ کے اذہان، فکراورنظریات کے مطابق نظام بن گیا۔

یہی حال ہمارے پڑوسی ملک افغانستان میں ہوا۔ افغانستان میں جو جنگ لڑی گئی، وہ بھی بنیادی طور پر جہاد حریت یعنی آزادی کی جنگ تھی۔ اس میں اصل زوراس وقت آیا جب روسی افواج افغانستان میں داخل ہوگئیں۔ اس موقع پرتمام علماء بھی اٹھ کھڑے ہوئے، اس لیے کہ ہمارے فقہی تصورات کی رو سے بھی کسی مسلمان ملک پر کسی غیرمسلم حکومت کی فوجیں حملہ آور ہوجائیں تو پھر دفاع فرض عین ہوجاتا ہے، لہٰذا اس جذبے سے سرشار ہوکر پوری قوم اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے کھڑی ہوگئی۔ ہم نے اس پر بھی جہاد فی سبیل اللہ کا لیبل دے دیا اور دنیا بھر میں اس کا ایسا ڈنکا بجا کہ جذبہ شہادت سے سرشار نوجوان پوری دنیا سے کھنچ کر چلے آئے۔ میں سمجھتا ہوں ان کے دل میں وہی جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ تھا، لیکن اس کی اصل کیفیت اور نوعیت تو جہاد حریت کی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روسی افواج افغانستان سے نکل گئیں اورآپس میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ جہاد فی سبیل اللہ کا یہ نتیجہ کبھی نہیں ہوسکتا۔''

(جہاد فی سبیل اللہ، ص ۶، ۷)

پرتشدد حکمت عملی کے مضرات

یہ بات نہیں کہ ڈاکٹر صاحب دینی مقاصد کے لیے قوت، زور بازو اور مسلح جدوجہد کے جواز کے قائل نہیں۔ وہ نہ

صرف اس کے قائل بلکہ داعی ہیں، یہاں تک کہ انھوں نے اہل سنت کے ہاں پائے جانے والے اس عمومی تصور سے بھی اختلاف کیا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے خلاف مسلح بغاوت کسی حال میں جائز نہیں، تاہم، اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلح جدوجہد کی کامیابی کے لیے مطلوبہ شرائط اور خاص طور پر ایسے کسی بھی اقدام کے عملی نتائج کو ملحوظ رکھنے کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں اور اسی تناظر میں انھوں نے موجودہ حالات میں اس طریقے کو اختیار کرنے والے عناصر کی تائید نہیں کی۔ فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کے ایک خاص طبقے میں ایک خیال پیدا ہوا کہ ہمارا بھی تو ایک نظام ہے۔ یہ انگریز کا لایا ہوا بھی ایک نظام تھا، فرانسیسیوں کا دیا ہوا نظام بھی ایک نظام تھا اور ہمارا بھی ایک نظام ہے، ہم کیوں نہ اس کو نافذ کر دیں۔ یہ اصل میں اس آزادی کا ایک ثمرہ تھا کہ مسلمانوں میں ایک خود آ گاہی پیدا ہوئی اور انھوں نے اسلام کو بطور ایک دین کے سمجھا، لہٰذا احیائی تحریکیں ابھریں۔ انڈونیشیا میں مسجومی پارٹی، انڈو پاک میں جماعت اسلامی، ایران میں فدائین، عرب دنیا میں الاخوان المسلمون جیسی تحریکیں ابھریں۔ یہ ساری تحریکیں اس لیے اٹھیں کہ اسلام دین ہے اور دین اپنا غلبہ چاہتا ہے، ہمیں دین کو غالب کرنا ہے۔

لیکن بعض عوامل کی وجہ سے ان تحریکوں کو آج تک کہیں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔.... ان مسلمان تحریکوں نے طریق کار غلط اختیار کیا۔ دنیا میں اسلام ایک نظام کی حیثیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا کیا تھا اور یہ دوبارہ برپا ہو سکتا ہے تو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہو سکتا ہے۔ انھوں نے سمجھا وہ تو آؤٹ آف ڈیٹ ہے، پرانا ہے، لہٰذا الیکشن میں حصہ لے کر اس سے اسلام نافذ کریں گے۔ اس میں ناکامی ہوئی تو گولی چلانی شروع کر دی کہ فلاں فلاں کو مار دو۔ چنانچہ سادات کو قتل کر دیا گیا، سادات گیا تو حسنی مبارک آ کر براجمان ہو گیا (چند روز قبل میرے پاس ایک نوجوان آیا کہ میرا دم گھٹ رہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ پرویز مشرف کو قتل کر دوں۔ میں نے کہا تمھارا دماغ خراب ہے؟ تم ایک پرویز کو قتل کرو گے، کوئی اور پرویز آ کر بیٹھ جائے گا، فائدہ کیا ہوگا؟) تو کہاں تبدیلی ہوئی ہے؟ فوجی حکومت کے ذریعے سے کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟ اس اعتبار سے اس غلط طریق کار نے ان تحریکوں کو کہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔..... دینی تحریکوں کا طریق کار غلط ہے۔ انھوں نے ballot یا bullet کا راستہ اختیار کیا۔ یہ دونوں راستے غلط ہیں اور یکساں غلط ہیں۔''

(موجودہ حالات میں اسلام کا مستقبل، ص ۳۳، ۳۴، ۳۵)

''آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ طریق انقلاب واضح ہو جائے۔ آج مسلمانوں میں جذبے کی کمی نہیں ہے۔ ہزاروں لوگ جانیں دے رہے ہیں۔ اپنے جسموں سے بم باندھ کر اپنے جسموں کو اڑا رہے ہیں۔ کشمیر

کے اندر جو جذبہ ابھرا، اسے پوری دنیا نے دیکھ لیا۔ کشمیریوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ تو لڑنے والی قوم ہے ہی نہیں، اب اس کے اندر جان پیدا ہو چکی ہے۔ پاکستان سے جا کر کتنے لوگوں نے وہاں پر جام شہادت نوش کر لیا۔ لیکن اسلامی انقلاب کا طریق کار یہ نہیں ہے۔ اس سے کہیں کامیابی نہیں ہوگی۔ اس طریقے سے آپ صرف اپنا غصہ نکال سکتے ہیں۔ آپ نے جا کر افریقہ میں امریکہ کے دو سفارت خانوں کو بم سے اڑا دیا، اس سے امریکی تو دس پندرہ مرے، جبکہ ۲۰۰ وہاں کے لوکل افریقی مر گئے۔ فائدہ کیا ہوا؟ بس یہی کہ آپ نے اپنا غصہ نکال لیا۔ تو ان طریقوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' (ص ۳۱)

''اگر ہم مشتعل ہو کر اسلحہ اٹھائیں تو کس کے خلاف اٹھائیں گے؟ بری افواج یا ایئر فورس کے خلاف؟ کیا ہماری ماضی کی حکومتوں نے بلوچستان میں دو مرتبہ ایئر فورس استعمال نہیں کی؟ کیا ایئر فورس کے ذریعے سے حافظ الاسد نے ایک دن میں ہزاروں اخوان ختم نہیں کر دیے تھے اور ان کا مرکز بمباری کر کے تباہ و برباد نہیں کر دیا تھا؟ تو آج مقابلہ بہت غیر مساوی (unequal) ہے۔.... جنگ اگرچہ جائز ہے، لیکن موجودہ حالات میں عملاً ممکن نہیں ہے۔ آج کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف یک طرفہ جنگ ہی موزوں لائحہ عمل ہے۔'' (ص ۲۹، ۳۰)

ان چند اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم غلبۂ اسلام کے مقصد کے ساتھ ایک والہانہ وابستگی رکھنے کے باوجود اس ضمن میں کی جانے والی جدوجہد پر نقد و نظر کی ضرورت سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس پورے عمل پر مسلسل ناقدانہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں احیاے اسلام صرف ایک جذباتی خواہش کا عنوان نہیں جو ان تحریکوں کی غیر حکیمانہ ترجیحات سے صرف نظر کرنے پر آمادہ کر دے، بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کے احیا اور امت مسلمہ میں فکری انقلاب کی دعوت لے کر اٹھنے والی یہ تمام تحریکیں بہر حال انسانی بصیرت اور اجتہاد ہی کی مرہون منت ہیں اور نتیجتاً ان تمام کمزوریوں اور نقائص کی زد میں ہیں جن سے انسانی فکر کبھی کلی طور پر مبرا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی تحریکوں کے ہاں فکری و عملی ترجیحات کے لحاظ سے Trial and error کے انداز کا ایک ارتقا پایا جاتا ہے اور شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ منزل تو دور کی بات ہے، ابھی تک ان کے ہاں جادۂ منزل کی تعیین کے حوالے بھی مجموعی اعتبار سے کوئی یکسوئی نہیں پائی جاتی۔ کہیں ہدف کی تعیین میں غلطی ہوگئی ہے، کہیں موثر حکمت عملی وضع کرنے میں کوتاہی فکر مانع ہوگئی ہے، کہیں طول مسافت نے صبر و حوصلہ کا دامن ہاتھ سے چھڑوا دیا ہے اور کہیں پڑاؤ کے مقامات کو منزل یا منزل کا متبادل سمجھ کر وہیں ڈیرہ ڈال لیا گیا ہے۔ اس صورت حال کا ایک لازمی تقاضا یہ بنتا ہے کہ خود ان احیائی تحریکوں کے انداز فکر، ترجیحات، حکمت عملی اور کارکردگی کو کڑی تنقید کی کسوٹی پر مسلسل پرکھا جاتا

رہے اور اس قافلے کو سوے منزل رواں دواں رکھنے کے لیے فکر تازہ کی حدی کسی انقطاع کے بغیر سنائی جاتی رہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے حصے کی ذمہ داری ادا کر کے دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں۔ اب یہ ان کے قائم کردہ حلقہ فکر کی ذمہ داری ہے کہ وہ پورے شعور، بصیرت اور استقامت کے ساتھ اس روایت کے تسلسل کو قائم رکھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعض دوسری اصلاحی واحیائی تحریکوں کی طرح ایک فکری کیمپ کے ساتھ وابستگی کا احساس رفتہ رفتہ اتنا غالب آ جائے کہ حریت فکر اور خود تنقیدی کی جگہ سکوت و اغماض لے لیں اور نقائص اور کمزوریوں کی جرات مندانہ نشان دہی کی جگہ پردہ پوشی بلکہ بعض صورتوں میں حمیت جاہلیہ کا رویہ پروان چڑھنے لگے۔ 'اللّٰھم انصر من نصر دینك واجعلنا منھم واخذل من خذل دینك ولا تجعلنا معھم'۔ آمین

پروفیسر خورشید عالم

عہد رسالت میں خواتین کا سیاسی کردار

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۲)

آثار قدیمہ کی کھدائی سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ اس شادی سے بلقیس کے یہاں جولڑ کا ہوا، علامہ عبداللہ یوسف علی نے اس کا نام Mengelek لکھا ہے اور کہا ہے کہ اس نے اپنی ماں سے مل کر حبشہ (Abyssinia) کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ عورت کے سیاسی کردار اور اس کی حکمرانی کے بارے میں یہ قطعی دلیل ہے۔

ام عیسیٰ

قرآن حکیم میں حضرت مریم کی پیدایش کا ذکر سورۂ آل عمران (۳) کی تین آیات (۳۵-۳۷) میں کیا ہے۔ ارشاد ہے:

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. (۳:۳۵)

''جب عمران کی بیوی نے کہا کہ اے پروردگار، جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے، میں اس کو تیری نذر کرتی ہوں، اسے دنیا کے کاموں سے آزاد رکھوں گی۔ تو (اسے) میری طرف سے قبول فرما۔ تو خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

اس عمران کا پورا نام عمران بن ماثان اور ان کی بیوی کا نام حنّہ بنت فاقوذ ہے۔ لاطینی میں یہ Anna اور

انگریزی میں Anne ہے۔ وہ حضرت زکریا کی بیوی ایشاع بنت فاقوذ کی بہن تھیں۔ انگریزی میں انھیں Elisabeth کہا جاتا ہے۔ اس نذر میں لڑکے کے بارے میں حسن طلب ہے، کیونکہ بیت المقدس کی خدمت کے لیے لڑکوں ہی کو وقف کیا جاتا تھا اور لڑکی کو اس قابل نہ سمجھا جاتا تھا۔

جب عمران کی بیوی نے لڑکی کو جنم دیا تو انھوں نے کہا: ''میرے پروردگار، میرے تو لڑکی ہوئی ہے''۔ یہ الفاظ حسرت وغم کی وجہ سے اس کے منہ سے نکلے۔ انھیں اس بات کا ڈر تھا کہ اب منت کیسے پوری ہوگی۔ اللہ مریم کی والدہ کے حسرت ویاس بھرے الفاظ کے جواب میں فرماتا ہے کہ افسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے جو بھی جنا ہے، اللہ اسے بہتر جانتا ہے۔ یہ بات اللہ نے مولود کی عظمت وشان بیان کرنے کے لیے کہی ہے، یعنی وہ اس مولود سے بہت بڑا کام لینا چاہتا ہے۔ وہ اسے دنیا جہاں کے لیے نشانی بنانا چاہتا ہے۔

اگلا جملہ بھی اللہ کا قول ہے: 'لَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی' (وہ لڑکا جو تیرے ذہن میں ہے، اس لڑکی کی طرح نہیں)۔ یعنی جس لڑکے کی تمنا اور طلب تو نے کی تھی، وہ اس لڑکی کے مانند نہیں جو تجھے عطا کی گئی ہے۔ مقام افسوس ہے کہ اردو کے اکثر مترجمین نے اپنے ذہنی پس منظر کی وجہ سے اس جملے کا غلط ترجمہ کیا ہے۔ صرف مولانا احمد رضا خان بریلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی نے صحیح ترجمہ کیا ہے۔ علم بیان میں مشبہ اور مشبہ بہ کے قاعدے کے مطابق یہ ترجمہ کہ ''لڑکا لڑکی نہیں ہوتا''، قطعی غلط ہے۔ امام زمخشری نے اس پر خوب صورت بحث کی ہے۔ آیت مبارکہ کا یہ ٹکڑا اس بارے میں نص قطعی ہے کہ عورت اور مرد میں وجہ فضیلت جنس نہیں، بلکہ ذاتی کردار ہے۔

اللہ فرماتا ہے: مریم کے رب نے مریم کو قبول کیا اور خوب قبول کیا اور اچھے طریقے سے اس کی نشوونما کی اور زکریا کو ان کا کفیل بنایا۔ گویا مریم وہ پہلی خاتون ہیں جنھیں بیت المقدس کی خدمت کے لیے قبول کیا گیا اور انھوں نے رسم خانقاہیت کی خودساختہ زنجیروں کو توڑا۔ حسن تربیت کے پیش نظر ایک نبی کو ان کا سرپرست بنایا۔ وہ عفت و عظمت اور اطاعت وفرماں برداری جیسی صفات سے متصف ہو کر پروان چڑھیں۔

مریم کا مقام ومرتبہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ. (آل عمران ۳: ۴۲)	''جب فرشتوں نے کہا: اے مریم، بے شک اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور پاک بنایا ہے اور ساری دنیا کی عورتوں پر تجھے فضیلت دی ہے۔''

فرشتے براہ راست حضرت مریم سے ہم کلام ہوئے۔ کلام حضرت جبرائیل نے کیا۔ جمع کا صیغہ اس لیے استعمال ہوا کہ وہ جب بھی نزول کرتے ہیں، ان کے ہمراہ فرشتوں کی جماعت ہوتی ہے۔ فرشتوں نے نام لے کر حضرت مریم کو پکارا تا کہ وہ اجنبیت محسوس نہ کریں اور جو وحی ان کی طرف کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے آمادہ ہو جائیں۔

لفظ 'اِصْطِفَاء' کا تکرار تاکید اور مبالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ پہلا 'اِصْطِفَاء' (انتخاب) آغاز عمر میں ان پر کی گئی نعمتوں کی شکل میں ہوا۔ لڑکی ہونے کے باوصف ان کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے اللہ نے قبول کیا۔ اللہ ان سے ہم کلام ہوا اور ان کو ہر قسم کے خلقی عیوب سے پاک کیا۔ دوسرا انتخاب اس وقت ہوا جب ان کے یہاں حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے۔ وہ اور ان کا بیٹا ساری دنیا کے لیے ایک آیت (معجزہ) ہے۔ اللہ نے اس عظیم امانت (حکمۃ اللہ) سپرد کرنے کے لیے تمام دنیا کی عورتوں میں سے مریم کا انتخاب کیا۔ یہ ایسا شرف ہے جس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ قرآن نے عصمت کی حفاظت کے دو نمونے پیش کیے ہیں۔ مردوں میں حضرت یوسف اور عورتوں میں حضرت مریم۔ سورۂ تحریم (۱۲:۶۶) میں اللہ کا قول ہے ''اور (مومنوں کے لیے مثال بیان کی) عمران کی بیٹی مریم کی جنھوں نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا''، یعنی عفت و عصمت میں وہ مومن عورتوں کے لیے بھی ضرب المثل ہیں اور مومن مردوں کے لیے بھی۔ عرب 'المریم من النساء' (عورتوں میں مریم) اس عورت کو کہتے ہیں جو نہایت پاک باز ہو اور مردوں سے جرأت سے بات کر سکتی ہو۔

حضرت مریم نبی تھیں

قرآن مجید میں 'اِصْطِفَاء' کی اصطلاح انبیا کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ چنانچہ صاحب ''البحر المحیط'' نے (۲/ ۴۷۶ میں) اس آیت کی تفسیر میں ایک قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد نبوت ہے، کیونکہ فرشتے ان کے سامنے ظاہر ہوئے اور ان کا نام لے کر اللہ کا پیغام پہنچایا۔ امام ابن حزم (حوالہ پیچھے دیا جا چکا ہے) فرماتے ہیں:

> ''اسی طرح ہم دیکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ جبرئیل کو مریم کے پاس بھیجتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے فرشتہ کہتا ہے: ''میں صرف تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں''۔ یہ حقیقی وحی اور اللہ کی طرف سے ان کی طرف حقیقی پیغام کے ذریعے حقیقی نبوت نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا اس آیت میں صاف طور پر نہیں کہا گیا کہ مریم کے یہاں جبرئیل اللہ کا پیغام لے کر آئے نیز جب زکریا جب مریم کے حجرے میں آتے تو ان کے پاس غیب سے اللہ کا لایا ہوا رزق پاتے ....۔ علاوہ ازیں حضرت مریم کی نبوت پر ایک اور دلیل یہ بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ اللہ نے سورۂ کھٰیعص میں ان کا ذکر انبیا علیہم السلام کے زمرہ میں کیا ہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا: ''نبیوں میں سے وہ ہیں

جن پر اللہ نے انعام کیا آدم کی نسل سے اور ان سے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا اور ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے اور ان میں سے جنھیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا۔'' (۱۹:۵۸) آیت کے اس مفہوم میں مریم کی تخصیص کر کے ان کو انبیاء کی فہرست سے الگ کر دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔''

امام موصوف نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت مریم کے لیے 'صدیقة' کا لفظ اس طرح مانع نبوت نہیں، جس طرح حضرت یوسف کے لیے 'صدیق' کا لفظ۔

اس کے علاوہ امام صاحب نے مسلم کی اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جو حضرت ابو عیسیٰ سے مروی ہے:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: كمل من الرجال كثير ولم يكمل من النساء الا مريم بنت عمران وآسية امرأة فرعون.	''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مردوں میں سے بہت سے کامل ہوئے ہیں، مگر عورتوں میں سے صرف مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ۔''

حدیث میں جس کمال کا ذکر ہے، اس سے مراد نبوت ہے۔ امام قرطبی نے اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں آل عمران (۳) کی آیت ۴۲ کے تحت اس رائے کی تائید کی ہے۔ مردوں میں سے کامل چند انبیا ہوئے ہیں جن کو دوسرے انبیاء پر فضیلت حاصل ہے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اسی طرح عورتوں میں وہی درجۂ کمال کو پہنچی ہیں جن کا ذکر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کیا ہے۔

حضرت عیسیٰ کی پیدایش

قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰ کی پیدایش کو جس انداز میں پیش کیا ہے، اس میں ایک طرف تو حضرت مریم کے مرتبہ و مقام کا پتا چلتا ہے اور دوسری طرف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضبوط شخصیت تھیں جنھوں نے جرأت کے ساتھ معاشرے کے طعنوں کا سامنا کیا۔ حضرت عیسیٰ کی پیدایش کا ذکر سورۂ آل عمران (۳:۴۴)، سورۂ مریم (۱۹:۲۶)، سورۂ انبیاء (۲۱:۹۰) اور سورۂ مومنون (۲۳:۵۰) میں ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آل عمران، سورۂ مریم اور سورۂ انبیاء میں حضرت مریم اور حضرت زکریا کا قصہ ایک ساتھ بیان ہوا ہے، دونوں قصوں میں خارق عادت ہونے کی قدر مشترک ہے۔ حضرت زکریا نے جب حضرت مریم سے پوچھا کہ یہ رزق تمھارے پاس کہاں سے آیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: اللہ کے ہاں سے، یہ بات سن کر ان کے دل میں بچے کی تمنا پیدا ہوئی جس کے لیے انھوں نے اپنے رب کو پکارا، دوسری اہم بات یہ ہے کہ سورۂ آل عمران، سورۂ مریم اور سورۂ انبیاء میں حضرت مریم اور

ان کے بیٹے کا ذکر دیگر انبیاء کے ساتھ ہوا ہے۔ آل عمران میں حضرت آدم، حضرت نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کے انتخاب کے بعد حضرت مریم کی پیدایش کا ذکر ہے۔ سورۂ مریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ حضرت زکریا کے قصے کے بعد مریم کا قصہ کی اس کتاب میں ذکر کریں۔ خطاب کا انداز بالکل وہ ہے جو حضرت ابراہیم، موسیٰ، اسماعیل اور ادریس علیہم السلام کے لیے اختیار کیا گیا ہے اور آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ ان نبیوں میں سے ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدم کی نسل سے اور ان لوگوں کی نسل سے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا۔ نیز ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے اور یہ سب ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں ہم نے راہ راست دکھائی اور منتخب کر لیا (مریم ۱۹: ۵۸)۔

سورۂ مریم میں اللہ کا قول ہے:

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا. (۱۹: ۱۷)	''ہم نے ان کی طرف اپنی روح (جبرئیل امین) کو بھیجا تو وہ ان کے سامنے پورے مرد کی شکل بن گیا۔''

ایسی شکل میں جبرئیل کا سامنے آنا ان کی عفت کی آزمایش تھی۔ فرشتے کو دیکھ کر مریم کہنے لگیں: ''اگر تو متقی ہے تو میں تجھ سے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں''۔ وہ جانتی تھیں کہ اللہ کی پناہ کا اثر اسی پر ہوسکتا ہے جو صاحب تقویٰ ہو۔ وہ اللہ سے پناہ مانگتی ہیں اور اجنبی کے اندر تقویٰ کے جذبات ابھارتی ہیں۔ ایک نیک اور کنواری لڑکی جو حضرت زکریا کی زیر تربیت تھی، ایک صحت مند مرد کو دیکھ کر اس کے شرم وحیا کا کیا عالم ہوگا۔ ایک ایسا اجنبی جس کے بارے میں ابھی تک ان کو یقین نہ تھا کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا ہے۔ فرشتے نے ان کی حیرانی دور کرنے کے لیے کہا: ''میں تمھارے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں''۔ فرشتے کی بات سن کر مریم کہنے لگیں: ''اے میرے رب، میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا؟ مجھے تو کسی بندہ بشر نے چھوا تک نہیں''۔ حضرت مریم اس بات کا تصور بھی نہ کرسکتی تھیں کہ لڑکا مرد اور عورت کے ملاپ کے بغیر بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس لڑکی کے مانند، جس کی عزت خطرے میں ہو، ہمت اور جرأت سے کام لے کر یہ سوال کرتی ہے کہ نہ مجھے بشر نے چھوا ہے اور نہ میں بدکار ہوں۔ دو ہی طریقے ہیں جن سے بچہ پیدا ہوتا ہے: مس بشر (نکاح کا کنایہ) سے یا بدکاری سے۔ اس لیے انھوں نے دونوں سے انکار کیا۔ یہ اسلوب تفخیم کے بعد تخصیص کا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ان کی عصمت پر کوئی داغ نہ آئے۔ اس پہلو کی طرف توجہ دلانے کے لیے دوسری نفی میں 'کَان' استعمال ہوا ہے جو اس بات کا اعلان ہے کہ اس مقام پر 'بَغَاء' (بدکاری) کی نفی لازم تھی۔ وہ بتانا یہ چاہتی تھیں کہ ان موانع کے ہوتے ہوئے بچے کا وجود ناممکن ہے۔ انکار کا اعادہ

ان سخت معاشرتی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا ہے جو بن بیاہی لڑکی کو بچے کی پیدایش کی صورت میں پیش آتے ہیں۔ اس لیے پہلی نفی کے بعد 'بغاء' (بدکاری) کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے۔ مریم کے اس سوال پر فرشتے نے کہا: ''یونہی ہوگا تیرا پروردگار کہتا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے تاکہ اس کو لوگوں کے لیے اپنی طرف سے نشانی اور رحمت بناؤں اور اس بات کا فیصلہ ہو چکا ہے''۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کی پیدایش کے دو مقصد تھے: ایک یہ کہ ان کی معجزانہ ولادت لوگوں کے ذہن میں اللہ کے ارادے اور اس کی قدرت کو راسخ کر کے انھیں پھر سے اللہ کے راستے پر ڈال دے۔ دوسرے یہ کہ وہ توبہ کرنے والوں کے لیے رحمت اور تسکین کا باعث بنیں۔ یہاں حضرت جبرائیل اور حضرت مریم کے درمیان مکالمہ انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

''پھر اس لڑکے کا حمل ٹھہر گیا اور مریم اس کو لے کر ایک دور جگہ چلی گئیں'' (۱۹: ۲۲)۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے میں دور دراز جگہ سے مراد ناصرہ ہے جو یروشلم کے شمال مشرق میں ہے۔ سورۂ انبیاء (۲۰: ۹) اور سورۂ تحریم (۶۶: ۱۲) میں اللہ کا قول ہے کہ ہم نے ان کے اندر اپنی روح پھونک دی۔ یہ نفخۂ الٰہی ہے جس نے تولیدی انڈے میں جان ڈال دی۔ نفخہ نے مادہ منویہ کا رول ادا کیا جو اپنی طبعی رفتار چل کر بچے کی شکل اختیار کر گیا۔

نفخہ کے نتیجے میں حضرت عیسیٰ کی پیدایش رحم مادر سے ہوئی، مدت حمل بھی طبعی تھی، یہاں تک کہ جب یہ مدت ختم ہوئی اور حضرت مریم نے دردزہ محسوس کیا تو کھجور کے تنے کے پاس آ گئیں اور اس پر ٹیک لگا لی تاکہ وضع حمل میں آسانی ہو اور اوٹ کے طور پر بھی استعمال ہو۔ اب ان کو ذہنی کرب کے ساتھ جسمانی کرب کا بھی سامنا تھا۔ ایک تن تنہا کنواری لڑکی جو پہلی بار اس تجربے سے گزر رہی تھی جس کے بارے میں وہ بے خبر تھی۔ وہاں کوئی مونس و غم خوار نہ تھا۔ اجنبیت اور قوم کے سوال و جواب کا ڈر سوسائٹی میں بدنامی کا خوف چنانچہ ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ''کاش، میں اس سے پہلے مر گئی ہوتی اور بھولی بسری ہو گئی ہوتی''۔ یہ ان کے اندرونی احساسات کی صحیح تعبیر تھی۔ اس وقت ان کے نیچے کی جانب فرشتے نے ان کو آواز دی کہ غم نہ کر تیرے پروردگار نے تمھارے لیے نیچے ایک چشمہ پیدا کر دیا ہے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ حضرت مریم ایک ٹیلے پر تھیں جہاں کھجور کا درخت تھا۔ موسم سرد تھا، تنا خشک تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

> ''اور کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ، تم پر تازہ تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی تو کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ اگر تم کسی آدمی کو دیکھو تو کہنا کہ میں نے اللہ کے لیے روزے کی منت مانی ہوئی ہے، آج میں کسی آدمی سے

ہرگز کلام نہیں کروں گی۔'' (مریم ۱۹: ۲۵-۲۶)

سب باتیں معمول سے ہٹ کر ہو رہی ہیں۔ چشمہ اور کھجوریں صرف کھانے پینے کے لحاظ سے وجہ تسکین نہ تھیں، بلکہ یہ دونوں معجزے یہ ثبوت دے رہے تھے کہ مریم پاک باز ہیں اور ان کا کردار شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اللہ تعالیٰ مریم کو تسلی دیتا ہے کہ جس طرح وہ اسباب کے بغیر پانی اور کھجور کو وجود میں لا سکتا ہے، بالکل اسی طرح وہ بغیر باپ کے بچہ بھی پیدا کر سکتا ہے اور وہ آپ کا دامن ان وسوسوں سے صاف کر سکتا ہے جو رسم و رواج کے اسیر لوگوں کے دل میں کھٹک رہے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس مقام پر بڑی خوب صورت بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مومنہ اور قانتہ بندی کے لیے وہ شانیں دکھائیں جو پوری تاریخ انسانی میں صرف اسی کے لیے ظاہر ہوئیں۔ کوئی اور اس میں اس کا شریک و سہیم نہیں۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۶۴۶)

یہ سب اس لیے کہ اللہ نے مریم اور ان کے بیٹے کو لیے ایک علامت (آیت) بنانا تھا۔

''آنکھوں کی ٹھنڈک'' کا محاورہ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ کی والدہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کو ممتا کے جذبات کا کس قدر خیال ہے۔

اللہ قدم قدم پر مریم کی رہنمائی کرتا ہے اور فرماتا ہے اگر تم کسی آدمی کو دیکھو، یعنی اگر تمھیں سوسائٹی کا سامنا کرنا پڑے تو کہنا کہ میں نے اللہ کے لیے لوگوں سے بات نہ کرنے کی منت مانی ہوئی ہے، اس سے لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ یہ سب معجزہ ہے اور مریم کا دامن پاک ہے۔ حضرت مریم کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ اس عمل میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ ایسا ثبوت درکار تھا جس سے سوسائٹی مطمئن ہو جائے کہ وہ بے گناہ ہیں۔ اس بات کے لیے حضرت عیسیٰ کا معجزانہ کلام ان کے اپنے کلام سے بڑھ کر تہمت کے رد کی قدرت رکھتا تھا۔ یہ ماں اور بیٹے، دونوں کا معجزہ تھا۔

''پھر وہ اسے اٹھا کر اپنی قوم کے لوگوں کے پاس لے آئیں، وہ کہنے لگے کہ مریم، یہ تو تو نے برا کام کیا، اے ہارون کی بہن، نہ تو تیرا باپ بد اطوار آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔''

یہ حضرت مریم کا کڑا امتحان تھا۔ ذرا اس دہشت کا تصور کیجیے جو بچہ ان کی گود میں دیکھ کر ان کی قوم پر طاری ہوئی ہو گی۔ وہ کون لوگ تھے، حضرت ہارون کی نسل کے پیشہ ور کاہن۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی پاک باز بیٹی جو بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف تھی، اپنی گود میں بچہ اٹھائے ہوئے تھی۔ کہنے لگے: تو نے تو بری حرکت کی ہے، تیری نسبت تو ہارون نبی سے ہے۔ تیرے ماں باپ تو ایسے لوگ نہ تھے۔ تو نے اپنی نسل کو بدنام کر دیا ہے۔ تو مریم نے اس بچے کی طرف اشارہ کیا، یعنی میری طرف سے وہ جواب دے گا۔ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں۔ اگر وہ کوئی توجیہ پیش

کرتیں تو کیا وہ لوگ غیظ وغضب کے عالم میں اسے قبول کرتے؟ ایک کنواری لڑکی بچہ اٹھائے ان کے سامنے کھڑی ہے اور اس کی طرف اشارہ کررہی ہے، گویا وہ ان کا مذاق اڑا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے کیا کیا پیچ وتاب نہ کھائے ہوں گے۔ روایت ہے کہ انھوں نے انھیں سنگ سار کرنے کا ارادہ کیا، مگر حضرت عیسیٰ اپنی ماں کی مدد کو آئے، ان کا دفاع کیا اور ان کی بے گناہی کو ثابت کیا۔ وہ بول اٹھے: ''کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے'' (۱۹: ۳۰)۔ ایک شیر خوار بچے کے منہ سے یہ الفاظ سن کر قوم کو یقین ہو گیا کہ مریم کا دامن ہر قسم کی برائی سے پاک ہے اور اس بچے کی پیدایش یقیناً اللہ کی جانب سے ایک معجزہ ہے۔

ایک نبی اپنی ماں کی وفاداری کا دم بھرتا اور کہتا ہے:

''مجھے اللہ نے اپنی ماں کا فرماں بردار بنایا ہے اور سرکش و بدبخت نہیں بنایا۔'' (مریم ۱۹: ۳۲)

آیت کے اس ٹکڑے سے ایک طرف تو حضرت مریم کا مرتبہ ومقام واضح ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کی براءت کا اشارہ ملتا ہے، وگرنہ ایک نبی اپنی ماں کی وفاداری کا کیسے دم بھرتا؟

جس قدر تفصیل سے حضرت مریم کا ذکر قرآن میں ملتا ہے کسی اور خاتون کا نہیں ملتا، کیونکہ ان کو دنیا جہاں کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ ان کا ذکر سورۂ آل عمران، سورۂ مائدہ، سورۂ مریم، سورۂ انبیاء اور سورۂ مومنون میں ہے۔ ایک سورت کو ان کا نام دے کر اللہ نے ان کی عظمت کو دوبالا کر دیا ہے۔ یہ تھیں ایک خاتون حضرت مریم اور یہ تھا ان کا مرتبہ ومقام۔

خلاصۂ بحث

حضرت آدم اور حوا جنت میں ایک ساتھ تھے۔ دونوں کو ابلیس نے بہکایا، دونوں اپنے ارادے اور اختیار سے اس کے بہکاوے میں آئے، دونوں کو ایک ساتھ جنت سے نکلنے کا حکم ہوا، دونوں ایک دوسرے کے زوج کی حیثیت سے زمین پر اترے، دونوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور معافی مانگی۔ اللہ نے دونوں کی توبہ قبول کی۔

مرد عورت کا زوج ہے اور عورت مرد کی۔ دونوں نے مل جل کر جیون بتانا ہے۔ یہی اللہ کی مشیت ہے اور یہی فطرت کا تقاضا۔ اگر دونوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر مرد کے لیے علیحدہ معاشرہ تشکیل دیا جائے اور عورت کے لیے علیحدہ تو زندگی کا کارواں رک جائے گا اور تہذیب وتمدن کبھی بھی پنپ نہیں سکیں گے۔

قرآن نے جن جن چیدہ انبیاء کا ذکر کیا ہے، ان کی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں پرورش وتربیت کے مرحلہ سے لے کر حق وباطل کی آویزش کے مرحلہ تک ان کے مشن کو آگے بڑھانے اور عدل وانصاف پر مبنی نظام کے قائم کرنے میں

ان کے پہلو بہ پہلو شریک رہیں۔انھوں نے دینی، معاشرتی اور سیاسی سرگرمیوں میں ان کا ساتھ دیا اور اس راہ میں اپنی عزت و ناموس کو داؤ پر لگا کر اپنی جان تک کی پروا نہ کی۔تفصیل اوپر دی جا چکی ہے۔قرآن حکیم میں حضرت سلیمان اور ملکۂ سبا کا قصہ دینی اور دنیوی نظام حکومت کی واضح مثال ہے۔ملکۂ سبا نے اپنی طاقت وقوت اور جاہ و حشمت کے باوصف جنگ کا راستہ اختیار نہ کیا، بلکہ اپنی فطرت سلیم کی بنیاد پر حضرت سلیمان کے دربار میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔قرآن نے ان کی دانش مندی اور فطرت سلیم کو وجیہ انداز میں پیش کیا ہے۔اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت سلیمان نے ان سے شادی کر لی اور انھیں یمن کی حکمران کے طور پر بحال رکھا۔روایات یہی کہتی ہیں۔

اس قسط میں سابقہ انبیاء کے ادوار میں خاتون کے معاشرتی اور سیاسی کردار پر مقدور بھر روشنی ڈالی گئی ہے۔اگلی قسط میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد بابرکت میں خاتون کے اس کردار پر روشنی ڈالی جائے گی۔اللہ اس کی توفیق بخشے آمین۔

زمانۂ جاہلیت میں لوگ اللہ کو خالق و رازق مانتے تھے، مگر اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ حکم اور قانون بھی اسی کا چلے گا۔اللہ کی توحید کی بہت سی خصوصیات ہیں۔خلق و رزق بھی اس کی خصوصیت ہے، تقدیر و تدبیر بھی اس کی خصوصیت ہے، حکم و قانون بھی اس کی خصوصیت ہے۔عملی سیاست کی بنیاد حکم و قانون ہے اور اس خصوصیت کو ماننا ایک سیاسی عمل ہے۔حق و باطل کے درمیان اصل معرکہ تو یہی تھا کہ حکم کس کا چلے گا۔قرآن میں سورۂ انعام (۶:۵۷) اور سورۂ یوسف (۱۲:۴۰، ۶۷) میں ارشاد ہے:

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ.　　　　”حکم صرف اللہ ہی کا ہے۔“

دینی سرگرمیوں کو عموماً معاشرتی سرگرمیاں سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر یہ سرگرمیاں حکومت کی شکل اختیار کر جائیں یا ان کا تعلق تدبیر امور سے ہو تو انھیں سیاسی سرگرمیوں سے تعبیر کیا جائے گا۔جن واقعات کا تعلق دین کی جستجو، اس کی حوصلہ افزائی کرنے، نئے دین میں داخل ہونے، اس کی طرف دعوت دینے، اس کی خاطر مشکلات کا سامنا کرنے، وطن سے ہجرت کرنے، بیعت کرنے اور اس دین کے دفاع کی خاطر جہاد کرنے سے ہو، ان سب کو سیاسی سرگرمیاں سمجھا جائے گا۔ان سرگرمیوں میں مرد اور عورت کا اشتراک ایک فطرتی عمل ہے، کیونکہ مرد عورت کا زوج ہے اور عورت مرد کی زوج۔اللہ کی مشیت اور فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ مل جل کر زندگی گزاریں۔

قبول اسلام

اہل قبلہ میں سے جس نے سب سے پہلے رسول کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کیا، وہ ایک خاتون تھیں۔ وہ ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں اور جس نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے نماز ادا کی، وہ بھی خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ اللہ کے رسولؐ نے نزول وحی کے بعد جب ان کے پاس آ کر خبر دی تو انھوں نے بلا تردد کہا:

''اے چچا کے بیٹے، تجھے خوش خبری ہو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں خدیجہ کی جان ہے، مجھے امید ہے آپ اس امت کے نبی ہوں گے۔'' (السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/ ۷۳)

اس قول سے ثابت ہوتا ہے کہ اس خاتون کا رابطہ اپنے معاشرے سے قائم تھا اور اپنے اردگرد کے واقعات کا پورا ادراک تھا۔ جس اللہ نے محمدؐ کو وحی کے لیے تیار کیا تھا، اسی اللہ نے وحی کے آنے کے بعد محمدؐ کا استقبال کرنے کے لیے خدیجہؓ کو تیار کیا تھا۔ اس موقع پر جو تاریخی الفاظ انھوں نے کہے، وہ ان کی عقل و دانش کی واضح دلیل ہیں۔ انھوں نے کہا:

''اللہ کی قسم، اللہ کبھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا، کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور اپنے پرائے کا غم کھاتے ہیں۔'' (فتوح الشام ۱/ ۲۸۷)

انھوں نے رسول کی تصدیق کے لیے واقعاتی شواہد کو سامنے رکھا اور مزید تائید کے لیے وقت کے بہترین اور معتبر ماخذ ورقہ بن نوفل کی طرف رجوع کیا۔ وہ اہل کتاب کے عالم تھے جنھوں نے تصدیق کی کہ آپ پر وہی وحی اتری ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی۔

بخاری نے ''کتاب المناقب'' اور مسلم نے ''باب فضائل ام المومنین'' میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت خدیجہ غار حراء میں حیس (ایک قسم کا کھانا جو کھجور، گھی اور ستو سے تیار کیا جاتا ہے) لے کر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: اے محمد، خدیجہ اپنے ساتھ حیس لے کر آ رہی ہے، اللہ آپ کو حکم دیتا ہے کہ انھیں میرا اسلام کہو اور ان کو جنت میں گھر کی بشارت دو۔ جب حضرت خدیجہ پہنچیں تو نبی کریم نے انھیں اس بات کی خبر دی تو انھوں نے فرمایا: اللہ خود سلامتی ہے اور وہ سلامتی کا سرچشمہ ہے، جبریل کو میرا اسلام ہو۔ یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ جس سال آپ پر وحی نازل ہوئی حضرت خدیجہ نبی کریم کے پاس غار حراء میں جایا کرتی تھیں۔

قبول اسلام کے بعد انھوں نے تن من دھن سب کچھ اسلام کی دعوت کے لیے قربان کر دیا۔ ان کے قوی ایمان

نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حوصلہ بڑھایا۔آپ توحید کے پرچار سے سارے عرب کے شرک کا سامنا کر رہے تھے۔لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں سنتے تھے تو دل غمگین ہوتا تھا۔ایسے میں سیدہ خدیجہ ان کی ڈھارس بندھاتی تھیں۔ایک انسان جب دوسرے انسان کا ہم خیال ہو جاتا ہے تو اس انسان کا یقین اور عقیدہ پختہ تر ہو جاتا ہے۔ جبھی تو رسول کریم نے حضرت خدیجہ کی وفات کے سال کو عام الحزن (غم کا سال) قرار دیا اور ان کو عمر بھر نہ بھول پائے۔

خواتین کا قبول اسلام

مسلمان خواتین کو قبول اسلام کے بعد جس عذاب سے گزرنا پڑا اور جس طرح وطن چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ان کے یہاں ایک راسخ عقیدہ تھا جس کو انھوں نے پورے شعور کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے اپنے ارادے اور اختیار سے قبول کیا تھا۔اس میں تقلید اور بیعت کا شائبہ تک نہ تھا۔اس دعویٰ کے ثبوت کے لیے ان خواتین کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو اپنے باپ دادا، شوہروں اور عزیز و اقارب سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔

حضرت ام حبیبہ اور حضرت فارعہ رضی اللہ عنہما اپنے باپ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے پہلے مسلمان ہوئیں۔ عورت کے دل میں باپ کا جو مرتبہ و مقام ہوتا ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔باپ بھی کیا قریش کا سردار اور اسلام کے خلاف معرکوں میں ان کا کمانڈر۔حضرت عباس کی بیوی ام الفضل لبابہ بنت حارث اپنے شوہر سے پہلے مسلمان ہوئیں۔زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شوہر عاص بن ربیع سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوئیں اور ان کے شوہر نے اسلام لانے سے انکار کر دیا۔حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا اپنے بھائی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے پہلے مسلمان ہوئیں۔حضرت عمر ان کے گھر میں قرآن سننے کے بعد مسلمان ہوئے۔اقبال نے اس خاتون کے بارے میں کہا ہے:

تو میدانی کہ سوز قرأت تو
دگرگوں کرد تقدیر عمر را

حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہا اپنے والدین سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ام کلثومؓ کے علاوہ قریش کی کوئی خاتون نہیں جس نے اپنے والدین کو چھوڑ کر ہجرت کی ہو۔یہ تو مکہ مکرمہ کا حال تھا۔مدینہ میں حضرت ام سلیم بنت ملحان انصاری رضی اللہ عنہا انصار میں سے

سب سے پہلے مسلمان ہونے والوں میں تھیں۔ وہ اپنے شوہر مالک بن نضر کو بھی اسلام کی ترغیب دیتی رہیں جو شام کی طرف چلا گیا اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔ ابوطلحہ انصاری نے شادی کا پیغام بھیجا تو ام سلیمؓ نے جواب دیا: کیا تو نہیں جانتا کہ جس معبود کی تو پرستش کرتا ہے، وہ ایک درخت ہے جسے ضلال حبشی نے تراش کر بنایا ہے؟ اے ابوطلحہ، کیا تجھے معلوم نہیں کہ جس معبود کی تم پرستش کرتے ہو، اگر اسے آگ میں ڈالا جائے تو وہ جل جائے گا؟ کیا تو جانتا ہے کہ تیرا معبود ایک پتھر ہے جو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ ابوطلحہ نے جواب دیا: ہاں، ام سلیمؓ نے کہا: درخت اور پتھر کو پوجتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی؟ اگر تم اسلام قبول کر لو تو یہی میرا حق مہر ہو گا، حالاں کہ ابوطلحہ سب انصار سے زیادہ نخلستانوں کا مالک تھا۔

امام ذہبی نے ''سیر اعلام النبلاء'' (۵/ ۲۲۰) میں حضرت ثابت سنانی کا قول نقل کیا ہے:

''میری نظر میں ایسی کوئی عورت نہیں جس کا حق مہر ام سلیم سے بہتر ہو۔''

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد شریف زادیوں نے اسلام اپنے ارادے اور اختیار سے قبول کیا، نہ کہ اپنے باپ یا شوہر کی تقلید میں۔ غلاموں اور لونڈیوں کا بھی یہی حال تھا۔ انھوں نے اپنے آقاؤں کی مرضی اور منشا کے خلاف اسلام قبول کیا اور ان کے ظلم کا تختۂ مشق بنے۔ یہ غلام اور لونڈیاں جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے اپنے آقاؤں کا حکم ماننے پر مجبور تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنی مشکلات و مصائب کے پیش نظر وہ زندگی اور اس کے مقصد پر زیادہ غور و فکر کرتے تھے۔ ان کے دماغ آزاد لوگوں سے زیادہ آزاد تھے۔ ان کو اس بات کا ادراک تھا کہ انسانوں کی نجات کے لیے ایک آسمانی مسیحا کی ضرورت ہے۔ جب اس مسیحا کی آواز ان کے کانوں میں پڑی تو انھوں نے اپنے اقتصادی حالات کی پروا نہ کرتے ہوئے اس آواز پر لبیک کہا۔ صحیح بخاری (رقم ۳۶۴۴) میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

''میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت دیکھا، جب ان کے ساتھ پانچ غلام، دو عورتیں اور ابوبکر تھے۔''

ان پانچ غلاموں میں حضرت سمیہ (رضی اللہ عنہا) بھی تھیں۔ ان کو قریش کے سردار طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، مگر وہ اسلام چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھیں۔''

دار ارقم میں خواتین کا کردار

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں مردوں اور عورتوں، دونوں سے ملتے تھے۔ دار ارقم کا راز مردوں اور عورتوں

کے سینے میں ایک امانت تھا جس کی وہ دل و جان سے حفاظت کرتے تھے۔ روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کعبہ کے نزدیک قریش کو خطاب کیا تو انھوں نے انھیں بری طرح مارا پیٹا۔ انھیں گھر پہنچایا گیا۔ جب ان کو ہوش آیا تو انھوں نے اللہ کے رسول کے بارے میں پوچھا تو ان کی والدہ نے جواب دیا ہمیں آپ کے ساتھی کا کوئی علم نہیں۔ آپ نے کہا: ام جمیل بنت خطاب سے جا کر پوچھو، انھوں نے جا کر ام جمیل سے پوچھا کہ ابوبکر تجھ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: میں نہ ابوبکر کو جانتی ہوں نہ محمد کو۔ ہاں، اگر تو چاہتی ہے تو میں تمھارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔ پس وہ اس کے ساتھ ہولیں۔ انھوں نے حضرت ابوبکر کو دیکھا کہ وہ لیٹے ہوئے ہیں اور تقریباً قریب المرگ ہیں۔ ام جمیل نے پاس جا کر کہا: آپ کی فاسق و فاجر قوم نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ ان سے انتقام لے گا۔ حضرت ابوبکر نے ان سے اللہ کے رسول کا حال پوچھا تو وہ کہنے لگیں: آپ کی ماں سن رہی ہے۔ آپ نے فرمایا: کوئی بات نہیں، تو ام جمیل نے جواب دیا: وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ انھوں نے پوچھا: وہ کہاں ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: دار ارقم میں۔ حضرت ابوبکر نے کہا: بخدا، جب تک میں اللہ کے رسول کے پاس نہیں جاؤں گا، نہ کھانا کھاؤں گا اور نہ پانی پیوں گا۔ جب آپ کی حالت سنبھل گئی تو آپ ان دونوں کے سہارے اللہ کے رسول کے پاس گئے۔ آپ نے جھک کر حضرت ابوبکر کو بوسہ دیا۔

یہ روایت ابن کثیر نے 'البدایۃ والنہایہ' (۳۰/۲) میں نقل کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کئی مقامات پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ سے ملتے تھے، جبھی تو حضرت ابوبکر کو معلوم نہ تھا کہ آپ کس جگہ ہوں گے۔ ام جمیل فاطمہ بنت خطاب نے راز کی حفاظت کرتے ہوئے حضرت ابوبکر کی والدہ کو جگہ کے بارے میں بتانے سے گریز کیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی فہم و فراست سے حضرت ابوبکر کی مدد کرنے کا راستہ نکال لیا۔ اسی حادثہ کے دوران حضرت ابوبکر کی والدہ ام الخیر بنت صخر دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئیں۔ یہ دار ارقم کوہ صفا کے قریب تھا۔ فاطمہ بنت خطاب اور ان کا شوہر دار ارقم میں داخل ہونے سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ رملہ بنت عوف سہمیہ اور اسماء بنت عمیس بھی دار ارقم میں داخل ہونے سے پہلے مسلمان ہو چکی تھیں۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ خاتون اسلام کے اہم واقعات سے الگ رہی اور نہ ہی اس نے اپنی ذمہ داری نبھانے سے گریز کیا، خواہ وہ کتنی ہی بھاری ذمہ داری ہو۔ اس نے عقیدے کے راستے میں ایثار و قربانی کی اعلیٰ مثال قائم کی۔

ان تمام واقعات سے اس بات کی نفی ہوتی ہے کہ عہد نبوت میں عورت کی عقل محدود تھی۔ نہ وہ بحث و مباحثہ کے

قابل تھی اور نہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکتی تھی۔ مقام افسوس ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ جیسے پائے کے مفسر نے سورۂ روم کی آیت ۲۱ کی تفسیر میں اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اللہ کے قول 'خَلَقَ لَکُم' (تمھارے لیے پیدا کیا) میں اس بات کی دلیل ہے کہ عورتوں کو جانوروں اور نباتات کی طرح دوسرے منافع کی طرح ہمارے لیے پیدا کیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ کا قول ہے: 'خَلَقَ لَکُم مَّا فِی الْاَرْضِ' (زمین میں جو کچھ ہے، اس نے تمھارے لیے پیدا کیا ہے)۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ عورتوں کو نہ تو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور نہ ہی وہ مکلّف ہیں۔ ہمارا قول ہے کہ اللہ نے ان کو ہمارے لیے نعمت کے طور پر پیدا کیا ہے اور ان کو مکلّف اس لیے بنایا ہے کہ اس نعمت کا اتمام ہو، اس لیے نہیں کہ ان کو بھی اسی طرح مکلّف کیا جائے، جیسے ہمیں مکلّف کیا گیا ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں: نقل، حکم اور معنی۔ نقل تو یہ ہے کہ وہ اور ان کے علاوہ دوسری نعمتیں۔ حکم کی یہ صورت ہے کہ عورتوں کو بہت سے احکام کا مکلّف نہیں بنایا گیا۔ معنی کی یہ صورت ہے کہ عورت ضعیف ہے اور کم عقل ہے، بچے کے مانند، لیکن بچہ مکلّف نہیں۔ مناسب تو یہی تھا کہ عورت بھی مکلّف نہ ہوتی۔ لیکن ہم میں اس نعمت کی تکمیل تبھی ہو سکتی تھی جب ان کو مکلّف بنایا جائے تاکہ وہ عذاب سے ڈر کر اپنے شوہر کی فرماں بردار رہیں اور حرام سے رکی رہیں، وگرنہ فساد پھیل جاتا۔'' (التفسیر الکبیر ۱۳/۱۱۱)

بریں عقل و دانش بباید گریست

اس کے برعکس تاریخی واقعات سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ پہلی مسلمان خاتون کو اس کا ادراک تھا کہ دین اور اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں اللہ نے عورتوں اور مردوں سے یکساں خطاب کیا ہے اور عورت اپنے اعمال کے بارے میں انفرادی طور پر جواب دہ ہے اور سزا و جزا کی حق دار ہے اور وہ مرد کی جواب دہی کے تابع تھیں۔ علامہ ابن حزم ''الاحکام فی اصول الاحکام'' (۳/۳۳۷) میں فرماتے ہیں:

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کی طرف اسی طرح مبعوث تھے، جس طرح عورتوں کی طرف۔ اللہ اور اس کے رسول کے مخاطب مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ کسی حکم کو عورتوں کے علاوہ مردوں سے مخصوص کرنا اس وقت تک روا نہیں، جب تک قطعی نص نہ ہو اور اجماع نہ ہو۔''

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ کا حکم دیا گیا تو آپ نے اپنی پھوپھی صفیہ اور بیٹی فاطمہ کا نام لے کر دعوت دی۔ اس دعوت سے مردوں اور عورتوں کے درمیان ذاتی اور نسبی تعلق سے ماورا ایمان کا تعلق قائم کیا گیا۔

جن خواتین نے اسلام کی طرف سبقت کی، ان کی تعداد سیرت نگاروں کے مطابق ۲۱ بنتی ہے۔ ان میں قریش کے قبیلوں کی بھی خواتین تھیں اور اسماء بنت عمیس خثعمیہ، ام رومان، ام الفضل جیسی دوسرے قبیلوں سے بھی تعلق رکھتی

تھیں۔ لونڈیوں کی تعداد آٹھ تھی۔ اس وقت کل مسلمانوں کی تعداد ۶۳ تھی۔ مسئلہ عورت اور مرد کا نہ تھا، مسئلہ ہمت اور حوصلے کا تھا۔ بعض خواتین نے جذبۂ ایمان اور ہمت و حوصلہ کی بنیاد پر مردوں سے پہلے اسلام قبول کیا۔

دعوت اسلام میں خواتین کا کردار

ابتدائی مرحلہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم انفرادی طور پر چھپ چھپ کر دین کی دعوت دیتے تھے۔ مسلمان کسی بند گھر یا کسی خالی گھاٹی میں نماز ادا کرتے تھے۔ بلاذری رحمہ اللہ نے ''انساب الاشراف'' (۱۱۶/۱) میں روایت کی ہے کہ ''جب عصر کا وقت آتا تو مسلمان ایک ایک اور دو دو ہو کر گھاٹیوں میں بکھر جاتے''۔ اس مرحلہ میں خواتین کا کردار واضح تھا۔ انھوں نے اس مرحلہ کے راز کو افشا نہیں کیا۔ تین چار برس گزرنے کے بعد مسلمانوں کی تعداد چالیس سے تجاوز نہ کر سکی، جبکہ اہل مکہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ خاتون کا کردار محض راز کو چھپانے تک محدود نہ تھا۔ ام شریک رضی اللہ عنہا چوری چھپے قریش کے گھروں میں جا کر عورتوں کو اسلام کی طرف راغب کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ مکہ والوں کو خبر ہو گئی، انھوں نے اسے پکڑ کر کہا: اگر تمھارے قبیلے کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم تجھے سامان عبرت بنا دیتے، لیکن ہم تجھے تیرے قبیلے کی طرف واپس بھیج دیں گے۔

اس مرحلہ میں مسلمان خواتین کو اپنے دین اور عقیدے کے بارے میں اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا۔ ان کو اس بات کا وہم تک نہ تھا کہ یہ ذمہ داری محض مردوں کی ہے کیونکہ وہ ان کے مقابلے میں اس بات کی قدرت رکھتے ہیں۔ انھیں اپنی قدرت اور ہمت پر پورا بھروسا تھا۔

اللہ نے اپنے نبی کو بعثت کے تین برس بعد حکم دیا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ. (۱۶: ۹۴)	''پس جو حکم تم کو ملا ہے، وہ (لوگوں کو) سنا دو اور مشرکوں کا (ذرا) خیال نہ کرو۔''

یہ اعلانیہ دعوت جواب دہی اور جزا و سزا کے اعتبار سے مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں تھی، کیونکہ انسان ہونے کے اعتبار سے وہ دونوں مساوی تھے۔ جب 'وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ'، ''اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈراؤ'' (الشعراء ۲۶: ۲۱۴)۔

[باقی]